اشاعت کا ۹۶ واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

نومبر ۲۰۱۸ء

۱۵؍روپے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (نومبر)

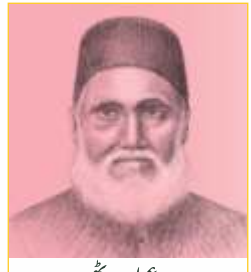
اسماعیل میرٹھی

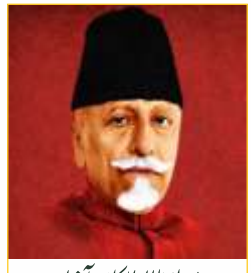
مولانا ابوالکلام آزاد

علامہ اقبال

یوسف ناظم

سجاد ظہیر

عمیق حنفی

عبدالقوی دسنوی

علی سردار جعفری

پروین شاکر

کرشن چندر

سید سلیمان ندوی

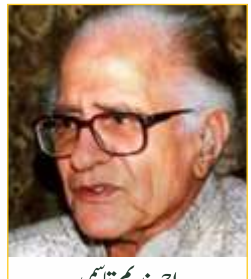
احمد ندیم قاسمی

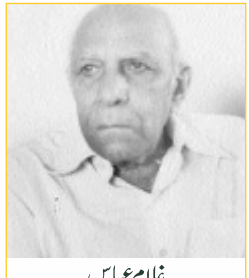
غلام عباس

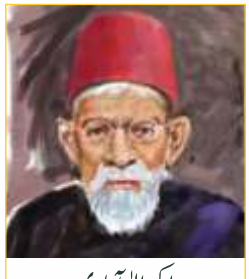
اکبرالہ آبادی

راجندر منچندا بانی

دلیپ بادل	یکم نومبر ۱۹۳۳ء	۱۳ر مارچ ۱۹۶۶ء
عبدالقوی دسنوی	یکم نومبر ۱۹۳۰ء	۷ر جولائی ۲۰۱۱ء
عمیق حنفی	۳ر نومبر ۱۹۲۸ء	۱۳ر اگست ۱۹۸۵ء
سلیم احمد	۳ر نومبر ۱۹۲۷ء	یکم ستمبر ۱۹۸۳ء
سجاد ظہیر	۵ر نومبر ۱۹۰۴ء	۱۳ر ستمبر ۱۹۷۳ء
مخمور دہلوی	۷ر نومبر ۱۹۰۰ء	۲ر فروری ۱۹۵۶ء
یوسف ناظم	۷ر نومبر ۱۹۲۱ء	۲۳ر جولائی ۲۰۰۹ء
علامہ اقبال	۹ر نومبر ۱۸۷۷ء	۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء
پریم وار برٹنی	۹ر نومبر ۱۹۳۰ء	۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۹ء
احسن مارہروی	۹ر نومبر ۱۸۷۶ء	۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء
ابوالکلام آزاد	۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء	۲۲ر فروری ۱۹۵۵ء

عزیز احمد	۱۱ر نومبر ۱۹۱۳ء	۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء
اختر الایمان	۱۱ر نومبر ۱۹۱۵ء	۹ر مارچ ۱۹۹۶ء
رویندر کالیا	۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء	۹ر جنوری ۲۰۱۶ء
جمنا داس اختر	۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء	یکم ستمبر ۲۰۰۹ء
اسماعیل میرٹھی	۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء	یکم نومبر ۲۰۱۷ء
منچندہ بانی	۱۲ر نومبر ۱۹۳۲ء	۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء
مختار الدین احمد	۱۴ر نومبر ۱۹۲۴ء	۳۰ر جون ۲۰۱۰ء
عنایت اللہ دہلوی	۱۵ر نومبر ۱۸۶۹ء	۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۳ء
احسن فاروقی	۱۵ر نومبر ۱۹۱۳ء	۲۶ر فروری ۱۹۷۸ء
اکبرالہ آبادی	۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء	۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء
مولوی عبدالحق	۱۶ر نومبر ۱۸۷۰ء	۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء

غلام عباس	۱۷ر نومبر ۱۹۰۹ء	۳ر نومبر ۱۹۸۲ء
جمیلہ ہاشمی	۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء	۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء
وحشت کلکتوی	۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء	۳۰ر جولائی ۱۹۵۶ء
احمد ندیم قاسمی	۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء	۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء
سید سلیمان ندوی	۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء	۲۳ر نومبر ۱۹۵۳ء
محمد احسن فاروقی	۲۲ر نومبر ۱۹۱۴ء	۲۶ر اپریل ۱۹۷۸ء
قتیل شفائی	۲۲ر نومبر ۱۹۱۹ء	۱۱ر جولائی ۲۰۰۱ء
کرشن چندر	۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء	۸ر مارچ ۱۹۷۷ء
پروین شاکر	۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء	۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء
علی سردار جعفری	۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء	یکم اگست ۲۰۰۰ء
محمود ہاشمی	۲۹ر نومبر ۱۹۳۹ء	۲۲ر ستمبر ۲۰۰۹ء

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۳ شمارہ : ۷

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

نومبر ۲۰۱۸ء

پبلشر : ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

شرینواس ترپاٹھی، غزال ضیغم

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ — اپنی بات ۲

مضامین

ابن صفی ..... پروفیسر مجاور حسین ۳

کاش کھل جاتے ذرا ابن صفی کے اسرار ..... پروفیسر عباس رضا نیر ۱۵

ابن صفی کے ناولوں کی شعریات ..... خالد جاوید ۲۰

ابن صفی؛ جاسوسی ادب کا روشن ستارہ ..... محمد زاہد ۲۴

ابن صفی؛ اردو کا طبعزاد جاسوسی ناول نگار ..... شبیر عباسی ۲۷

پاپولر لٹریچر اور ابن صفی کی جاسوسی دنیا: ایک مطالعہ ..... صالحہ صدیقی ۳۱

ابن صفی اور اردو ادب ..... اسریٰ رضوی ۳۵

نظمیں اور غزلیں

کاغذ نم رہا ..... احمد وصی ۳۹

ان کہی بات ..... احمد سہیل ۴۰

قافلہ چلا تو تھا ..... رفیعہ جعفر ۴۰

غزلیں ..... نظیر باقری، ضمیر سید پوری ۴۹

غزلیں ..... راکیش راہی، اسیف جائسی ۵۰

افسانے

شاید ..... پروفیسر حسین الحق ۴۱

اہم موڑ ..... پروفیسر شاہ محمد وسیم ۴۳

روٹیوں کی قید میں ..... بشریٰ صدیقی ۴۶

گزشتہ لکھنؤ

لکھنؤ کا چکن اور کامدانی ..... مرزا جعفر حسین ۵۱

خواب سراب (بیانیہ کے حوالے سے) ..... سفینہ بیگم ۵۴

ترقیات

ریاستی حکومت عوامی فلاح وبہبود کے لئے پُرعزم ..... محمد غفران نسیم ۵۹

تبصرے

اتالیق بی بی (انور حسین خاں) ..... نجیب انصاری ۶۲

عوامی مرثئے کی روایت (لئیق رضوی) ..... عابد حسین حیدری ۶۳

مراسلات

خطوط ۶۴

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

نیادور کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ رثائی ادب کے خصوصی شمارے کی جس طرح قارئین نے پذیرائی کی اس نے ہمیں یہ حوصلہ دیا کہ ہم زیر نظر شمارے میں ایک خصوصی گوشہ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں پر پیش کر رہے ہیں۔ جاسوسی ناول ہمارے مقبول عام ادب کا ایک حصہ ہے۔ اور دنیا کی سب ہی زبانوں میں جاسوسی ناولوں کی عوامی مقبولیت رہی ہے۔ اردو میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو تیرتھرام فیروز پوری سے نہ واقف ہو وہ ایک کامیاب مترجم تھے اور معلوم نہیں کتنی جاسوسی ناولوں کے انھوں نے ترجمے کئے اور خود ناول لکھے۔ لیکن ابن صفی نے جس تسلسل سے اردو میں طبع زاد جاسوسی ناول لکھے وہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے فریدی اور عمران کے دو ایسے کردار تخلیق کئے اور جس کامیابی کے ساتھ ان کی کردار نگاری کی اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ زبان و بیان، کردار نگاری، ماجرہ سازی، اور کشمکش Suspence پر ان کو زبردست قدرت حاصل تھی۔ ان کے ناولوں کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ لوگوں کو ہر ماہ اس کی اشاعت کا انتظار رہتا تھا۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس شمارے کے لئے ہمیں اردو کے بڑے قلمکاروں کا تعاون حاصل ہوا پروفیسر مجاور حسین اردو کے اہم ناقد اور مقبول ناول نگار ہیں۔ انکا اور ابن صفی کا برسوں ساتھ رہا ہے انھوں نے ہماری درخواست پر ابن صفی پر خصوصی مضمون لکھ کر اس شمارے کے وقار اور اس کی ادبی حیثیت میں اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر نیر جلالپوری صاحب نے ابن صفی کے ناولوں میں پراسرار عناصر کا تجزیہ کیا ہے یہ مضمون اس لئے بھی اہم ہے کہ پراسراریت جاسوسی ناول کا ایک اہم جز ہے جو قاری کی توجہ ناول سے ہٹنے نہیں دیتا۔ خالد جاوید صاحب نے ابن صفی کے ناولوں کی شعریات سے بحث کی ہے۔ یعنی ان کا ناول کن بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور عام ناولوں کے مقابلے میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ شبیر عباسی صاحب، ڈاکٹر محمد زاہد، اسریٰ رضوی اور صالحہ صدیقی نے ابن صفی کے ناولوں کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے جس سے ابن صفی اور خود جاسوسی ناول کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسانوں کے حصے میں اس ماہ اردو کے مشہور افسانہ نگار حسین الحق صاحب، شاہ محمد وسیم صاحب اور بشریٰ صدیقی کے افسانے شائع کر رہے ہیں یہ ہمارے معتبر افسانہ نگار ہیں۔

لکھنؤ اپنے ادب اور کلچر کے لئے ہی نہیں مشہور ہے یہاں کی صنعت خاص طور پر چکن، کامدانی اور مٹی کے پھل بنانے کا کام اپنا جواب نہیں رکھتا۔ پھل تو ایک زمانے میں ایسے بنتے تھے کہ اچھے اچھے لوگوں کو اصل پھل کا شبہ ہوتا تھا اسی طرح چکن اور کامدانی کی صنعت ہے جس کی ساری دنیا شہرت رہی ہے۔ اس شمارے میں ہم لکھنؤ تہذیب کے شناسا اور ادیب کار مرزا جعفر حسین کا مضمون چکن کی صنعت اور کامدانی پر، گزشتہ لکھنؤ کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں مشہور ناقد و فکشن نگار

نیادور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیادور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں

پروفیسر انیس اشفاق کے نئے ناول خواب سراب پر ایک مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس بار شعری حصے میں غزلوں کے ساتھ تین نظمیں بھی پیش خدمت ہیں جن میں پرانی مستند اور نئی معتبر آوازیں شامل ہیں باب تبصرہ میں دو نئی کتابوں پر تبصرے ہیں امید ہے کہ یہ گزشتہ شمارے کی طرح آپ کو پسند آئے گا۔ ہمیں آپ کے خطوط کا انتظار رہے گا۔ اگر رسالے میں کسی طرح کی کمی محسوس ہو تو ضرور مطلع کریں تا کہ ہم اسے دور کر سکیں۔

نومبر بھی جاتے جاتے ہمیں اداس کر گیا اس ماہ ہمارے کئی بہت اہم ادیب ہمیں داغ مفارقت دے گئے جن کی جگہ کبھی پر نہیں ہو سکے گی۔

ممتاز شاعرہ فہمیدہ ریاض کا 11 نومبر 2018 کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اردو شاعری کی تاریخ کا وہ ایک ہم نام تھیں۔ اردو میں تانیثی شاعری کی وہ ایک بڑی مثال مانی جاتی ہیں۔ وہ ایک نظم گو شاعرہ تھیں ایک غیر روایتی شاعرہ کی حیثیت سے اردو میں انھوں نے اپنی ایک شناخت بنائی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران ان کی بہت پذیرائی ہوئی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے انھیں 'پوئٹ اِن ریزی ڈنس' کا مرتبہ دیا وہ کچھ عرصہ سینئر ریسرچ فیلو بھی رہیں اس کے علاوہ وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ریسرچ اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل ریسرچ سے بھی وابستہ رہیں۔

نوجوان ناقد و صحافی اور اردو کے استاد رانچی کالج رانچی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا 27 نومبر 2018 کو ایرا میڈیکل لکھنؤ میں انتقال ہو گیا وہ ایک بیحد خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے وہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور مرتب تھے۔ ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے جے این یو میں تعلیم حاصل کی انھوں نے پہلی کتاب مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری پر لکھی جس پر ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اس کے بعد سبط محمد نقوی، انیس اور انیس شناسی، انیس کا شعور فن، ذرہ بھر روشنی اور پروفیسر شارب ردولوی کے حوالے سے کئی سی کتابیں لکھیں۔ بہت کم وقت میں انھوں نے جتنا کام کیا اور جو شہرت پائی وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہوگی۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ریحان حسن شعبہ اردو امرتسر یونیورسٹی میں لکچرر ہیں۔

ہریانہ کے مشہور شاعر میکش انبالوی کا چندی گڑھ میں انتقال ہو گیا کشمیری لال ذاکر کے بعد ہریانہ کے لئے یہ ایک بڑا ادبی سانحہ ہے۔ ان کے غم میں ہریانہ اردو اکیڈمی کے اراکین نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ادارہ نیا دور ان ادیبوں اور شاعروں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ایک بات:

آپ سے صرف ایک درخواست ہے کہ اردو پڑھئے اور اپنے بچوں کو اردو پڑھایئے۔ وہ قومیں غلام ہو جاتی ہیں جو اپنی زبان اور تاریخ کو بھول جاتی ہیں۔ اردو ہماری تہذیبی زبان اور ہماری شناخت ہے۔ اس کی بقا ہماری قومی یکجہتی کی ضرورت ہے۔

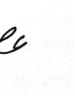

اسرار احمد (ابن صفی)
عہد آفریں شخصیت

پروفیسر مجاور حسین

4/14، آفیسرس کالونی
ڈالی باغ، لکھنؤ
رابطہ: 7376811599

اسرار احمد کا قلمی نام ابن صفی تھا۔ لیکن یہ نام حقیقی ہی تھا۔ اس لئے کہ صفی اللہ ان کے والد کا نام تھا۔ ناول نگاری سے پہلے وہ اسرار ناروی کے تخلص کے ساتھ شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی بعض غزلیں بیحد مشہور تھیں۔ مثلاً ۱۹۴۲ء میں جب وہ آٹھویں درجہ کے طالب علم تھے تب انہوں نے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان تھا 'للہ نہ روکو، جانے دو' اس کے کچھ مصرعہ یاد ہیں:

وہ دیکھو افق کے سینے پر
لہرائے شہیدوں کے دامن
بننے کو ہے لالہ زارِ وطن
پھر سے شہداء کا مدفن
اب دیر ہوئی روکو نہ ذرا
للہ نہ روکو جانے دو

یہ نظم اتنی مقبول ہوئی تھی کہ کوئی یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ شاعر آٹھویں درجہ کا طالب علم ہے۔ وہ نارہ کے رہنے والے تھے اور حضرت نوح ناروی جانشین مرزا داغ دہلوی بھی نارا کے تھے۔ نارہ میں زیادہ تر مسلم کائستھوں کی آبادی تھی۔ اسرار بھی مسلم کائستھ تھے اور کہا کرتے تھے کہ تم لوگ تو اتفاقیہ مسلمان ہو اس لئے کہ مسلمان گھر میں پیدا ہو گئے لیکن میں اس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں جس نے سمجھ بوجھ کر اسلام قبول کیا۔

اسرار میٹرک پاس کرنے تک شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔ ان کا ترنم بھی اچھا تھا اور وہ اپنے ساتھیوں میں اپنے شاعر ہونے کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ ان کی نظم 'بانسری کی آواز' خاصی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ وہ مجھ سے اس وقت ملے جب انہوں نے انٹر کر لیا تھا اور بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ وہ حسن منزل میں رہتے تھے۔ مکان نمبر ۱۵ تھا۔ حسن منزل ایک طویل عمارت کا نام تھا جو حسن جان خاں مختار نے بنوائی تھی۔ اس عمارت میں تقریباً ۲۰ رہائشی کمرے تھے۔ ہر کمرے کے پیچھے ایک چھوٹا سا صحن تھا اور ضروریات زندگی سے متعلق چھوٹے چھوٹے غسل خانے تھے۔ بیچ میں دس گھر کے بعد ایک گیٹ تھا جو ۱۹۴۷ء تک پاکستان گیٹ کہلاتا تھا اس لئے کہ اس گیٹ کے اندر کی پوری آبادی کٹر مسلم لیگی تھی۔

اسی کے سامنے والا حصہ محلہ اترسویا کا حصہ تھا جس میں لکڑی کی ٹال وغیرہ تھی۔ پاکستان گیٹ سے ہی متصل سدھی خاں کی دکان تھی جس میں کلیجی کی سیخیں، کباب اور گرمیوں میں لسی ملا کرتی تھی اور یہ دکان اسرار کی محبوب دکان تھی۔ وہ کباب کے بیحد شوقین تھے اور بھنی ہوئی کلیجی ان کی کمزوری تھی۔ اتفاق سے میرے والد صاحب کی بھی کمزوری یہی تھی اس لئے ان سے اور اسرار سے خوب نبھتی تھی۔ پھاٹک کے اندر شفیق بانسری والے رہا کرتے تھے۔ اسرار نارہ کے تھے۔ میں نے ایک بار کہا کہ اماں! تم ناروے کے ہو، ہندوستانی نہیں ہو؟ انہوں نے کہا: دیکھو! تمہارے بزرگ بھی کہیں اور سے آئے تھے۔ آریا ہو۔ ہماری زبان نہ کھلواؤ۔ ہم تو نارے کے ہیں، ناروی لکھتے ہیں، تم آریائی کیا لکھوگے، تمہارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔

وہ ہائی اسکول میں مولوی متین صاحب سے بہت متاثر تھے۔ ان کا پورا کلام مولوی صاحب کی نظر سے گزرتا تھا اور داد وتحسین کے الفاظ وفقروں سے انہیں نوازا جاتا تھا۔

میری ان کی ملاقات ۲؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی جب داخلہ لینے کے بعد یونیورسٹی میں اردو کے کلاس میں میں ان کے پاس پیچھے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر حفیظ سید پڑھا رہے تھے۔ ان کا سر بالکل شفاف سلیٹ کی طرح تھا البتہ حاشئے پر سفید بالوں کے لچھے تھے اور پیچھے کے حصے میں بال کچھ اس طرح تھے جیسے داڑھی کے بال ہوتے ہیں۔ میں اسرار صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے ٹھوکا دے کے کہا، ذرا دیکھو! ہمارے سر کے پیچھے داڑھی ہے۔ حفیظ سید صاحب نے یہ فقرہ سن لیا اور چھڑی لے کر مارنے آئے۔ اسرار بھاگ نکلے مگر اس طرح کہ پکڑ لئے جائیں۔ حفیظ سید صاحب نے انہیں پکڑ لیا اور فوراً اسرار نے سر جھکا کے کہا:

سر دوستاں سلامت تو بہ خنجر آزمائی! لایئے کنّی۔

وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔ غالباً انہیں اس طرح کے جواب کی توقع نہیں تھی۔ چھڑی فضا میں لہرا کے رہ گئی۔

وہ اس طرح کی کئی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے ہم محلہ ہیں اور صرف ہم محلہ ہی نہیں بلکہ ان کا مکان میرے مکان کے بالکل مقابل میں ہے یعنی وہ ۱۵؍حسن منزل میں رہتے ہیں۔

میں اس زمانے میں ٹیوشن کر کے گزر اوقات کرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نومبر ۱۹۴۷ء میں مجھے سہ روزہ نیا دور میں بحیثیت مترجم ۱۵؍روپئے پر جگہ مل گئی تھی۔ میری سفارش اکرم الہ آبادی صاحب نے نعیم صدیقی صاحب سے کی تھی۔ اکرم الہ آبادی اس وقت الہ آباد سے نیا اخبار نامی روزنامہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ اس کے ایڈیٹر اسرار احمد کریمی تھے لیکن نام کسی کا نہیں جاتا تھا۔

میں چونکہ اخبار میں کام کرتا تھا اس لئے ذرا احساس تفاخر کا شکار تھا۔ اسی زمانے میں جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا سانحہ پیش آیا اور میں نے گاندھی جی کی یاد میں ایک نمبر گاندھی نمبر کے عنوان سے نکالنے کا اعلان کیا۔ نعیم صدیقی صاحب نے میری تنخواہ میں تو اضافہ نہیں کیا تھا لیکن کام کے اعتبار سے میں ایڈیٹر بھی تھا، مترجم بھی تھا غرض کہ کتابت چھوڑ کے سب کام کرتا تھا۔

میں نے گاندھی نمبر کا اعلان کیا تو ایک روز اسرار صاحب صبح کو مجھے ملے۔ کہنے لگے کہ مجاور صاحب! گاندھی نمبر کے لئے یہ نظم لے لیجئے۔ میں نے نظم لے تو لی مگر دل ہی دل میں سوچا کہ محلے داری کا لوگ کتنا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ ہر محلہ میں دس بیس شاعر ہوتے ہیں۔ میں کہاں سب کی نظمیں شائع کرتا پھروں گا۔ مٹھی میں کاغذ لئے ہوئے، بہادر گنج تک آیا، جہاں دفتر تھا، پھر میں نے سوچا کہ نظم پڑھ تو لیں۔ اب جو نظم پڑھی تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس کا آخری شعر تھا:

لویں اداس، چراغوں پہ سوگ طاری ہے
یہ رات آج کی انسانیت پہ بھاری ہے

نظم تو میں نے کتابت کے لئے دے دی لیکن یہ آخری شعر جیسے ذہن میں چسپاں ہو گیا تھا۔ میں جب محلے میں آیا اور اسرار صاحب ملے تو میں نے کہا کہ میں نے نظم کتابت کے لئے دے دی۔ کہنے لگے: شکریہ۔ گردن تھوڑی سی ترچھی بھی ہو گئی تھی۔ میں نے پھر دہرایا۔ نظم کتابت کے لئے دے دی ہے۔ انہوں نے آنکھیں پھیلا کے مجھے گھورا اور بولے: بہت بہت شکریہ۔ میں نے تیسری بار کہا کہ میں نے نظم کتابت کے لئے دے دی ہے۔ کہنے لگے: آپ بار بار اس کی تکرار کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا: اس لئے کہ اگر یہ نظم جوش کی ہے تب تو وہ آنے سے رہے مگر ان کا کوئی مداح آ کے گردن دبوچے گا اور اگر نشور واحدی یا اور کسی کی ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے آنکھیں نکالیں اور بولے: میرے پاس اس وقت دس کا ایک نوٹ ہے۔ کوئی بھی اگر اس نظم کے لئے دعویٰ کرے گا تو یہ دس کا نوٹ بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا اور اتنی ہی دس عدد پیر کو زینت دینے والی میرے سر کی زینت بنا دیجئے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ نظم انہیں کی تھی۔ میں کہاں ثابت کرتا لیکن یہ یقین ہو گیا کہ یہ شاعر ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں میں ہی نہیں بلکہ الہ آباد میں کافی مشہور تھے۔

اس زمانے میں میرے ہم جماعت مصطفی زیدی جو بعد میں تیغ الہ آبادی ہوئے پھر انہوں نے تیغ 'کی قصابیت' پر فیض صاحب کے مشورے سے اپنا تخلص مصطفی زیدی ہی رکھا۔ ان کے پڑھنے کا انداز بہت زبردست تھا۔ وہ پورے مشاعرے پہ چھا جاتے تھے۔ گرج کر پڑھتے تھے اور شخصیت بھی اچھی خاصی

وجیہہ تھی۔ وہ میرے یہاں اکثر آتے تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں عباس حسینی صاحب نے پاکستان جانے کا ارادہ ترک کیا اور میں نے انہیں رسالہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ ان کے والد صاحب وہیلر میں مینیجر تھے اور خود بھی اپنے وقت میں مقبول ناول نگاروں کی صف میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے اس خیال کو پسند کیا اور 'نکہت' نام مسیح الزماں صاحب لیکچرر الٰہ آباد یونیورسٹی کے مشورے سے تجویز ہوا۔ اب روز شام کو ہم لوگ بیٹھتے تھے، بحث ہوتی تھی اور تخلیقات منتخب کی جاتی تھیں۔ اسرار بھی اس میں شریک ہونے لگے۔ اسی زمانے میں راہیؔ معصوم رضا جن سے دور کی رشتہ داری بھی تھی، وہ بحیثیت شاعر الٰہ آباد آئے۔ ان کی ایک نظم 'تھکے ہوئے مسافروں یہاں نہ ڈیرے ڈالنا' بہت مشہور ہوئی۔ وہ ہمارے یہاں آئے اور حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے۔ ملک زادہ منظور احمد گورکھپور میں چار سال میرے ساتھ رہے تھے۔ وہ بھی مجھ سے ملنے تشریف لائے اور پھر اکثر و بیشتر آنے لگے۔ اس طرح ایک حلقہ بنا جس میں لوگ ایک دوسرے کو پسند و ناپسند بھی کرتے تھے۔ مثلاً تیغ صاحب اسرار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ منظور بھی اسرار کو پسند نہیں کرتے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ راہی تو بالکل ہی پسند نہیں کرتے تھے مگر اسرار کو حسین حیدر صاحب یعنی عباس حسینی کے والد صاحب، عباس حسینی صاحب، ان کے بھائی جمال صاحب اور میں بیحد پسند کرتے تھے۔ اصل میں اسرار محفل کے آدمی نہیں تھے۔ جب لوگ اکٹھے ہوتے تھے تو وہ خاموش ہو جاتے تھے اور اپنے ہونٹوں کو سکوڑ کر گول دائرہ بناتے تھے اور پھر منھ چلایا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کی طرف دیکھ لیتا تو اسے یہی محسوس ہوتا کہ منھ چڑھا رہے ہیں۔

اسی زمانے میں فروری میں 'نکہت' شائع ہوا۔ جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے عباس حسینی صاحب کے ساتھ صرف میرا نام تھا۔ میں نے 'نکہت' کے قلمی تعاون کے لئے مختلف ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھوائے۔ اسی زمانے میں نازشؔ پرتاپ گڑھی خود تشریف لائے اور تب یہ معلوم ہوا کہ نازش اسرار کو جانتے ہیں۔ اسرار سے قربت اور بڑھی۔ جو مضامین آتے تھے ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور پھر وہ منتخب کئے جاتے تھے۔ ہمارے حلقہ میں وہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے اور انہوں نے اپنی نظم 'مرگھٹ کا پیپل' اشاعت کے لئے دی۔ وہ بڑے اچھے ترنم کے ساتھ ایک نظم 'کچھ رات گئے'، 'بانسری کی آواز' وغیرہ سنایا کرتے تھے۔ غزل بھی بہت اچھی کہتے تھے۔ ایک شعر اس وقت یاد آرہا ہے:

بس اتنا یاد ہے اے دوست وقت مئے نوشی
کسی کی یاد بھی آئی تھی دل کو سمجھانے

اسی زمانے میں وہ ایک مشاعرے میں مجھے اپنے ساتھ لے کے گئے۔ ٹرین میں ہی انہوں نے مجھے ایک نظم کہہ کے دے دی۔ آزاد نظم تھی، اور یہ کہا کہ تم مشاعرے میں پڑھ دینا۔ خود کے لئے بھی ایک نظم کہی جس کا عنوان تھا 'کالی گھٹائیں'

ابھری ابھری کالی گھٹائیں
سنکی سنکی ٹھنڈی ہوائیں
مہ پاروں کے آنچل ڈھلکے
چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
ایسے میں تقویٰ کی باتیں
واعظ ناداں دیکھ سنبھل کے

آخری بند تھا:

خون ابھی تک پیتے آئے
مرتے آئے جیتے آئے
خون ابھی کچھ زیر زمیں ہے
اٹھ کہ یہ ساقی دوست نہیں ہے
آؤ اسی طوفان میں مل کر
ہاتھ میں لیں جھونکوں کے خنجر
اور ایسے میخانے ڈھا دیں
خون پلانے کا بدلہ لیں

وہ کمیونسٹ تو نہیں تھے۔ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ نہیں تھے لیکن ان کے اندر ایک بامیانہ رجحان ضرور تھا۔ چنانچہ ۲۶ر جنوری پر انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جس کے کچھ مصرعہ یاد ہیں:

آزادی کی دیوی آئی
خوشیاں آج مناؤ نا!
اے دکھیارو! آنسو پوچھو
میں کہتا ہوں گاؤ نا!

آخری بندی تھا:

اب دھرتی سونا اگلے گی
بادل مئے برسائیں گے
اب صحراؤں کے سینے پر
رنگ محل بن جائیں گے
جب تک دھرتی سونی ہے
میری تقریریں کھاؤ نا!

اس طرح رجحان ان کی شاعری کا تھا۔ ان کی نثر نگاری کا کوئی اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ ایک روز وہ گھر میں تنہا تھے۔ ان کی والدہ اور ان کی بہن ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہ دونوں کہیں گئے تھے۔ انہوں نے مجھے کمرے میں بلایا تو ایک طرف بہت سارے کاغذات کا ڈھیر نظر آیا۔ اسی میں میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک افسانہ نما شئے دکھائی دی۔ میں پڑھنے لگا۔ جب آخری حصہ پڑھا تو واقعہ ہے کہ ابن صفی کے لفظوں میں 'میرے دیوتا کوچ کر گئے' میں نے ان سے کہا کہ یہ کہانی مجھے دیدو، میں چھاپوں گا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے! لے جاؤ۔

وہ کہانی 'چمپی' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ آخری دو سطروں تک معلوم ہوتا تھا کہ کسی آوارہ اور بدچلن لڑکی کا قصہ پڑھ رہے ہیں۔ آخری دو سطروں سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ان کی پالتو بلی تھی، محبوبہ نہیں تھی اور یہ تحیر کی کیفیت عرصہ تک قاری کو مبہوت رکھتی تھی۔

چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ آپ نکہت میں مزاحیہ کالم لکھیں۔ چنانچہ ایک عنوان 'نوک خار' طے کیا۔ ابتدائی دو مہینے اس عنوان کے تحت میں لکھ چکا تھا۔ میں نے وہ اسرار صاحب کے سپرد کیا اور وہ 'عقرب بہارستانی' کے نام سے 'نوک خار' لکھنے لگے۔ ان کی تحریروں میں مزاح اور کبھی کبھی طنز و مزاح دونوں ہوتے تھے۔

الٰہ آباد سے ایک صاحب نے نوائے ہند نام سے اخبار نکالا اور اسرار صاحب کی سفارش کی گئی اور وہ وہاں کام کرنے لگے لیکن ان کی نبھی نہیں اور انہوں نے ایک روز نہایت مہذب و مفرس گالیاں نوائے ہند کے مالک صاحب کو دیں اور چلے آئے۔ اتفاق یہ تھا کہ یادگار حسینی اسکول (اب یہ انٹر کالج ہے۔ پہلے یہ رانی منڈی میں تھا۔ اب اکبر الٰہ آبادی کی کوٹھی میں واقع ہے) کے لئے اردو کے ماسٹر کی تلاش تھی۔ اسرار صاحب وہاں منتخب کر لئے گئے۔ وہ اس وقت تک صرف انٹر تھے لیکن وہ بہترین مدرس ثابت ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر اجمل اجملی بہت مشہور ہوئے۔ غلام کبریا ناروی جب تک الٰہ آباد رہے، ادبی سرگرمیوں سے وابستہ رہے لیکن پھر پاکستان جا کے ان کی ادبی شخصیت ختم ہو گئی۔ اسی طرح بہت سارے لوگ تھے جن کی ادبی تربیت اسرار صاحب نے کی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں سے اپنے ساتھی اساتذہ کو بھی جھلاہٹ میں مبتلا کیا کرتے تھے۔

پنڈت شیو بھوشن لال ورماہندی پڑھاتے تھے۔ ہندی پڑھانے والا پنڈت اور عربی پڑھانے والا مولوی صاحب کہلاتا تھا۔ شیو بھوشن لال پنڈت جی کہلاتے تھے۔ تمام ٹیوشن کیا کرتے تھے۔ مسلمان حلقہ میں مقبول بھی تھے۔ اسرار کا وہ نشانہ تھے۔ ایک روز کہنے لگے۔ اسرار جی! تنک اپنی لیکھنی دے دیجئے۔ اسرار بولے: کیا کریں گے؟ جواب دیا: گرت۔ اسرار نے برجستہ کہا: گندی ہو جائے گی، نہیں دوں گا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک خاص طرح کا مزاج رکھتے تھے جس میں مزاح کا پہلو غالب رہتا تھا۔ چنانچہ نکہت میں جہاں نوکِ خار کے لئے عقرب کے نام سے وہ مزاحیہ کالم لکھتے رہے وہیں وہ کبھی کبھی نواحین میں بھی لکھتے تھے اور پھر انہوں نے ایک مضمون لکھا 'رسالہ نکالنا' اور یہ مضمون جب پڑھا گیا تو یہ طے ہوا کہ اسرار ایک نام اختیار کریں اور اسی نام سے نکہت میں ہر ماہ مضمون لکھا کریں۔ چنانچہ ان کا نام 'طغرل فرغان' تجویز کیا گیا اور وہ تقریباً ۱۹۵۲ء تک (جب تک نکہت باضابطہ شائع ہوتا رہا) لکھتے رہے۔

اسرار دوست آدمی تھے۔ بہت ہی بامروت تھے۔ ہم لوگ نکہت سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں حیدر صاحب نے سب کے لئے معمولی جیب خرچ مقرر کیا۔ میں اور اسرار ایک اسکیل میں تھے۔ اسرار باضابطہ طور پر یادگار کے ٹیچر تھے اور اب ان کی جیب زیادہ گرم رہتی تھی۔ چنانچہ اکثر و بیشتر شام کو صدیق کی دکان پر کلیجی یا کباب کی سیخ اڑائی جاتی۔ لسی سے ان کو دلچسپی نہیں تھی۔ باضابطہ پھاٹک کے اندر شفیق سے بانسری بھی سیکھنے جاتے تھے جو ان کو نہیں آسکی مگر شفیق کی بانسری کی تال پر انہوں نے نظم ضرور لکھی۔ وہ اپنے مضامین میں اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ مزاح الفاظ سے پیدا کیا جائے اور کبھی کبھی محل وقوع سے بھی مزاح کی تخلیق کرتے تھے۔ اردو میں اس وقت بحیثیت مزاح نگار شوکت تھانوی اور علیم بیگ چغتائی کا سکہ چلتا تھا۔ شوکت عام طور سے نسوانی حرکات کا پیرایہ اختیار کر کے بیگم کے ذریعہ مزاح پیدا کرتے تھے۔ عظیم بیگ کے یہاں تو ہلڑ ہنگامہ تھا۔ پطرس کی سنجیدہ مزاح نگاری اس وقت صرف اعلیٰ علمی طبقوں تک محدود تھی۔ اسرار نے اپنے مضامین میں ایک نیا طرز ایجاد کیا جہاں لفظ بھی کام کرتے تھے اور پیروڈی کا انداز بھی ہوتا تھا۔ تھوڑا سا محل وقوع سے بھی کام لیتے تھے مثلاً انہوں نے 'ماہنامہ خفقان کا اختلاج نمبر' ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں آزادی کے بعد جو رسالے نکلنا شروع ہوئے اور ان کے نمبر نکلنا شروع ہوئے، اس پر طنز کیا گیا تھا۔

ایک مضمون میں شاعروں کے نام کی پیروڈی کی گئی تھی۔ مثلاً سردار ابوالہول اور ایک منظر ملاحظہ ہو:

اس کا نام تھا یادگار مشاعرہ۔ شاعر نے شیر پڑھا:

دہک رہا ہے ان کا چہرہ شوخی کے انگاروں سے
ضبط کے خرمن پھونک رہے ہیں آگ لگے مہ پاروں میں

شعر ختم ہونے سے پہلے شاعر نے شمع اٹھائی اور جناب صدر کی داڑھی میں لگا دی۔ لوگوں نے کہا: بر بنائے انتقام ایسا کیا مگر اہل دل تاڑ گئے کہ معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر جب جناب صدر نے شاعر کو پڑھنے کی اجازت نہیں دی تو شاعر اٹھا اور اس نے جناب صدر کو اٹھا کر پٹک دیا اور دونوں ہاتھوں سے ان کا گلا دبا کے مسکرا کر بولا:

اجازت ہے! دبا دوں؟'

اس طرح وہ واقعات سے بھی مزاح پیدا کرتے تھے۔

اسرار صاحب کی حس مزاح بہت حد تک ان کی اپنی تھی۔ ویسے انہوں نے شفیق الرحمن کو بھی پڑھا تھا اور کہا کرتے تھے کہ یہ فنٹیسی کو 'مچرب' (یعنی اس کا چربہ اتارتا ہے) کر دیتا ہے۔ خود اسرار لیکاک، پی جی وڈہاؤس اور لیسلی چارٹرس سے متاثر تھے اور جب انہوں نے جاسوسی ناول لکھنا شروع کیا تو پہلا ناول 'دلیر مجرم' میں 'وکٹر گن' سے استفادہ کیا تھا۔ انہوں نے ایڈگر ویلیس، اگاتھا کرسٹی، پٹر شینی وغیرہ کو بھی پڑھا تھا اور ان سے صرف اثر قبول کیا تھا۔ سوائے 'پہاڑوں کی ملکہ' کے ان کا کوئی بھی ناول کسی انگریزی ناول نگار سے مستفاد نہیں ہے البتہ 'لاشوں کا آبشار' میں مسٹر کیو کا کردار اگاتھا کرسٹی کے کرنل براؤن سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔

۱۹۵۱ء میں الٰہ آباد میں ہیوٹ روڈ پر دیش سیوا پریس تھا جس کے مالک رام اوتار جائسوال تھے۔ وہ رانی منڈی کوفت گراں ٹولہ میں رہنے والے ایم ایل پانڈے سے متعارف ہوئے اور انہوں نے 'بھینکر بھیدیا' کے نام سے ایک ماہانہ میگزین پاکٹ سائز میں نکالی جس میں ہر مہینے ایک جاسوسی ناول شائع ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اور پانڈے جی ہم لوگوں کو اپنی فتوحات بھی بتاتے تھے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ انگریزی سے کس طرح ہندی میں اسے ڈھالتے ہیں۔ اس کی زبان بالکل اردو ہوتی تھی۔ رسم الخط دیوناگری ہوتا تھا اور کرداروں کے نام تو ہندوستانی ہوتے تھے لیکن ہوتے وہ انگریزی ہی تھے۔

ایک روز سنیما دیکھ کر ہم لوگ آ رہے تھے، راستے میں اس پر گفتگو ہونے لگی کہ کیوں نہ ہم لوگ اردو میں جاسوسی سلسلہ شروع کریں۔ اس وقت تک 'نکہت' اپنے انعامی معموں کی وجہ سے کافی تندرست ہو چکا تھا اور پھر دبلا بھی ہونے لگا تھا۔ اس لئے کہ شمع کے معمے کی طرح بہت سارے رسائل میں معمے نکلنے لگے تھے اور پھر معموں پر بھی زوال آ گیا تھا۔ چنانچہ عباس حسینی صاحب نے میری اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ جاسوسی دنیا کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ نکالا جائے جس میں ہر مہینے ایک جاسوسی ناول ہو۔ اس سلسلہ میں حیدر صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی۔ انہوں نے پسند فرمایا۔ وہ خود کسی زمانے میں جاسوسی ناول لکھا کرتے تھے۔ ان کا ناول 'محمود کی ڈائری' بہت مشہور ہوا تھا۔ ظفر عمر کا ناول 'نیلی چھتری' مارس لیبلانک کے ناول 'شاہی خزانے' کا آزاد ترجمہ تھا مگر انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بعد میں تحقیق ہوئی۔ 'نیلی چھتری' کے انداز کا ناول کامیاب ہو سکتا تھا۔

اس زمانے میں ڈکلیریشن دینے کے تقریباً ایک مہینے کے اندر ڈاک خانے سے رجسٹریشن مل جاتا تھا۔ چنانچہ جاسوسی دنیا کا نام بھی منظور ہوا اور رجسٹریشن بھی مل گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو یہ بات طے ہوئی کہ جاسوسی دنیا ہر مہینے شائع ہوگا اور اس میں ایک ناول لکھا جائے گا۔ ہر مہینے ناول لکھنے کے لئے راہی تیار ہوئے۔ وہ بہت زود نویس تھے۔ باتیں کرتے جاتے تھے اور لکھتے جاتے تھے۔ شاعرانہ نثر لکھتے تھے اور چونکہ ان کی رفتار میں ہلکی سی لکنت تھی اس لئے ان کے اوپر اسرار نے یہ مصرعہ بھی موزوں کیا تھا کہ:

'بلینک ورس میں فطرت نے شاعری کی ہے'

حیدر صاحب نے راہی کو یہ حکم دیا کہ وہ جاسوسی ناول لکھیں۔ راہی نے ناول لکھنا شروع کیا۔ یہ بات مجھے اور اسرار کو اچھی نہیں لگی اور اسرار نے یہ کہا کہ 'امے! کیا یہ ہم لوگوں کو لنگڑی مار دے گا؟' میں نے کہا کہ بھائی! میں کوشش کرتا ہوں۔

دوسری طرف راہی نے مسودہ تیار کر کے حیدر صاحب کے حوالے کیا۔ یہ طے ہوا کہ پڑھیں۔ راہی نے پڑھنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مشاعرہ ہو رہا ہے۔ ان کے ہر فقرے پر واہ واہ سبحان اللہ تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ شاعرانہ نثر جاسوسی ناول نگاری کے خلاف تھی۔ چنانچہ میں نے اس وقت کوئی رائے نہیں دی۔ اسرار سے کہا: یار! تم لکھو! دیکھا جائے گا۔ اسرار نے انگریزی کے ایک ناول سے استفادہ کرتے ہوئے 'دلیر مجرم' لکھا اور میں نے وہ ناول تو کاتب کے حوالے کیا اور راہی کے ناول کے لئے یہ کہا کہ اس میں وہ شاعری ہے جو کسی ایسے ناول کے شایان شان نہیں ہے۔ فوراً مجھ سے یہ مطالبہ ہوا کہ کیسا ناول؟ کوئی نمونہ دکھایئے۔ میں نے کہا کہ دیکھئے گا! مجھے دو دن کا وقت دیجئے۔ ادھر کتابت شدہ مسودہ آ گیا تھا۔ مشن پریس بھیج دیا گیا اور 'دلیر مجرم' شائع ہو کے آ گیا۔ سرورق چھپ چکا تھا۔ کتاب تیار ہو گئی اور اس پر تاریخ تو دو مہینہ آگے کی ڈالی گئی لیکن شمارہ اسٹالس پر دسمبر میں ہی پہنچ گیا تھا اور جنوری ۱۹۵۲ء سے گویا جاسوسی دنیا کا آغاز ہوا۔

اسرار جولائی تک ہندوستان رہے اور اگست میں وہ پاکستان گئے۔ مجھے آج بھی وہ منظر یاد ہے جب الٰہ آباد اسٹیشن پر ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے اور پھر جب ٹرین رینگنے لگی تو میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بڑی دیر تک مجھے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی اسرار ہم لوگوں سے رخصت ہو رہے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ چلے گئے تھے۔ اپنے ہی ساتھ یادوں کا خزانہ لے کر۔

تقریباً ایک مہینے تک کوئی خیر خبر نہ ملی۔ وہ ایک ناول 'مصنوعی ناک' نامکمل چھوڑ گئے تھے۔ ان کے مسودہ کا انتظار ہوتا رہا جو نہیں آیا تو آخر کار 'مصنوعی ناک' مجھے مکمل کرنا پڑا جس کا شمار جاسوسی ناولوں کے مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہاں سے اسرار کا مسودہ آتا رہا اور شائع ہوتا رہا۔ جاسوسی دنیا کی تاریخ مقرر تھی اور اسرار بھی بڑی پابندی سے نبھاتے رہے یہاں تک کی ۱۹۶۵ء میں وایا لندن ان کا مسودہ آیا۔

اسرار قول کے پابند اور بیحد ڈسپلن والے آدمی تھے۔ انہوں نے بحیثیت مدرس بھی اپنی دھاک بیٹھال لی تھی۔ بظاہر ان کی آمدنی کے ذرائع تین تھے لیکن ۱۹۴۹ء تک صرف ایک ہی ذریعہ تھا یعنی ان کے والد صاحب منی آرڈر سے روپیہ بھیجا کرتے تھے لیکن اچانک وہ سلسلہ بند ہو گیا تھا اور وہ ایک شعر ہم لوگوں کے سامنے گنگنایا کرتے تھے

پہلے آتا تھا ایک منی آرڈر
اب کئی ماہ سے نہیں آتا

یہ زمانہ ان کے لئے سخت تھا چنانچہ تعلیم پر اس کا اثر پڑا اور انہوں نے یادگار حسینی اسکول میں مدرسی کے لئے درخواست دی۔ کوئی سعی و سفارش نہیں تھی۔ اصل میں یادگار والے جو تنخواہ دے رہے تھے اس پر کسی پڑھے لکھے آدمی کا آنا ہی مشکل تھا یعنی صرف ۵۰/روپئے ماہانہ۔ اسرار تنہا امیدوار تھے اور ان کا

انتخاب ہو گیا۔ حالانکہ شرط یہ تھی کہ جو مدرس مقرر کیا جائے وہ اہل تشیع میں سے ہو۔ اسرار نے ایک شعر انٹرویو میں سنا دیا تھا جو درج کیا جا رہا ہے:

یزید و شمر کی آنکھوں سے کم نہیں ہوتی
غم حسین میں جو آنکھ نم نہیں ہوتی

یوں بھی نارہ میں محبان اہل بیت کی اکثریت تھی۔ ڈپٹی افعان صاحب ان لوگوں کے خلاف تھے جو عرف عام میں وہابی کہے جاتے ہیں۔ اسرار کا معاملہ بہت دلچسپ تھا۔ ان کے والد بریلوی مسلک کے تھے۔ والدہ دیوبندی مسلک کی تھیں۔ اسرار کے سارے احباب شیعہ تھے اور خود وہ کہا کرتے تھے:

'سُن! میں ہی سچا مسلمان، میں ہی شیعۂ علی ہوں۔ تم لوگ کہتے ہو کہ ماتم کرتے ہیں۔ تم کیا جانو ماتم کیا ہوتا ہے۔ اپنی عقل کا ماتم کرتے ہو۔ ہم سے سیکھو، محبت کس کو کہتے ہیں۔'

کسی مجلس میں میں نے ان کو شرکت کرتے نہیں دیکھا لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا ہو سکتی ہے کہ چک کے امامباڑے پر جو مجلس ہوتی تھی اور جب میں شام کو حلقۂ احباب میں اس مجلس کی توصیف میں کچھ کہتا تو اسرار پوری مجلس ہم لوگوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ مجلس انہوں نے کہاں سنی اور کیسے ان کو یاد ہوئی اور یہ آج تک راز ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک جلوس دریا آباد والوں کو صمدا آباد سے حسن منزل سے گزرتا ہوا علی منزل تک جاتا تھا۔ وہ جلوس جب گزرتا تھا تو یقیناً اسرار اپنے گھر سے باہر نکل آتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ جلوس علی منزل تک نہیں پہنچ جاتا۔ جب وہ پاکستان چلے گئے تو وہاں البتہ میں نے دیکھا کہ علامہ رشید ترابی کی مجالس سننے وہ جاتے تھے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک یادگار مجلس آج بھی حافظے میں محفوظ ہے جس میں میں نے ایک ٹرک کے اوپر جنرل یحییٰ خاں اور جنرل موسیٰ کو دونوں ہاتھوں سے ماتم کرتے دیکھا تھا اور اسرار اور میں پیچھے مجمع کے کھڑے ہوئے ان دونوں کا والہانہ انداز میں ماتم دیکھ رہے تھے۔ نشتر پارک میں جب علامہ رشید ترابی پڑھتے تھے تب بھی وہ جاتے تھے لیکن یہ میں نے محسوس کیا تھا کہ ان کے حلقۂ احباب میں یہاں بھی حالانکہ شیعہ حضرات تھے مگر سوائے میرے اور کوئی ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ رضا رسولپوری سے بھی وہ تھوڑا کترا کے رہتے تھے۔

جب وہ مدرس تھے تو ان کے تقرر کے وقت رضی الدین حیدر صاحب، صابر حسین نقوی، صدر و سکریٹری اور پھر عباس حسینی صاحب نے بہت زوردار موافقت کی تھی۔ تائیدی تقریر کی تھی اور ان کا انتخاب بھی ہو گیا تھا۔ بعض لوگ تھے جو خود خواہش مند تھے لیکن اسرار کے تقرر کے بعد ان لوگوں نے بھی یہ اعلان کیا کہ صحیح تقرر ہوا۔ اسرار نے پرائیوٹ بی اے کیا اور وہ کہا کرتے تھے۔

ابے تم لوگ میرا کیا مقابلہ کرو گے؟ تم تو اتنے بے وفا و بے مروت ہو کہ ایک درجہ ایک ہی سال میں چھوڑ دیتے ہو۔ میری وفاداری دیکھو! میں نباہتا ہوں۔

'وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے'

پاس تو سب ہوتے ہیں فیل ہو کے دکھاؤ اور یہ دیکھو! اس سال میں فلسفہ میں فیل ہو جاؤں گا۔

معلوم یہ ہوا کہ فلسفے میں انہوں نے ہر فلسفی کو ترکاری قرار دیا تھا۔ مثلاً ڈیکارٹے جو کہتا تھا کہ میں نے شک کی بنیاد پر اپنے وجود کو تلاش کیا۔ اس کے بارے میں لکھ کے آئے تھے کہ یہ ایک ترکاری کا نام ہے جو ہے تو بھنڈی مگر شک کی نظروں سے دیکھئے تو کبھی لوکی نظر آتی ہے اور کبھی مٹر پھلی۔

دوسرے سال انہوں نے پھر اعلان کیا کہ اس سال بھی میرا فیل ہونے کا ارادہ ہے اور یہ بتا کے گئے کہ اس بار میں ان فلسفیوں کو ٹھیک کر کے رہوں گا۔ چنانچہ اس بار ہر فلسفی سڑا ہوا پھل قرار دیا گیا۔ مثلاً ڈیکارٹے اس بار سیب تھا مگر اندر سے اس میں کیڑا پڑا ہوا تھا حالانکہ شک ہوتا تھا کہ سیب بہت ہی مفید ہے۔ تیسرے سال انہوں نے کوشش کی تھی اور اعلان بھی کیا تھا لیکن نمبر اردو کا تھا اور اردو والا بیوقوف نہیں بن سکا اور یہ پاس ہو گئے۔ اس بار یہ سب کو مٹھائیاں لکھ کے آئے تھے۔ جتنے انگریز اور جرمن فلسفی تھے ان میں سے کسی کو برفی اور جس کا فلسفہ پیچیدہ تھا اس کو امرتی قرار دیا تھا۔

جب نتیجہ آتا تھا تو خود ہی پھولوں کا ہار پہن کر کے احباب کو مٹھائی کھلاتے اور اکڑ کر یہ کہتے کہ پاس کرنا سب کا کام ہے۔ کہہ کے فیل ہونا کوئی مائی کا لال میرے علاوہ دعویٰ کرے اور فیل ہو کے دکھائے۔

وہ فلسفیوں کے سخت خلاف تھے۔ یہی کہتے تھے کہ یہ لوگ گمراہ کرتے ہیں مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ بی اے کا امتحان دیتے تھے تو ان کے مضامین میں اردو انگریزی ادب اور فلسفہ ہوا کرتے تھے۔ انگریزی ادب میں بائرن کا مذاق اڑاتے تھے اور راہی معصوم رضا کو کہتے تھے۔ بائرن آف اردو لٹریچر۔ اس لئے کہ راہی کی بائیں ٹانگ چھوٹی تھی انہیں دیکھ کے وہ اپنا مصرعہ گنگناتے تھے۔

تیغ صاحب (مصطفیٰ زیدی) ان کا خاص نشانہ تھے اور اس وقت یہ نشانہ بہت زوردار ہو گیا جب تیغ صاحب نے عشق میں خودکشی فرمائی۔ یہ اعلان کیا کہ انہیں سروج اور سرلا سے عشق ہے اور پھر وہ دونوں ان سے مذہبی دیواروں کی وجہ سے نہیں مل سکتیں۔ اسرار کو جب یہ خبر ملی تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کے اسپتال پہنچ گئے اور جب صرف ہم تین آدمی رہ گئے تو انہوں نے بڑی محبت سے تیغ صاحب سے پوچھا:

یہاں کون سی نرس پسند آئی؟

انہوں نے کہا: میں مر رہا ہوں.....

اسرار نے جملہ پورا ہونے سے پہلے کہا: یہی تو

میں پوچھ رہا ہوں کہ کس پر مر رہے ہو؟

اور پھر مجھے ساتھ لے کے وہ چلے آئے۔ انہوں نے ایسے عجیب وغریب مشورے جنسی تسکین کے لئے تیغ صاحب کو دئے تھے کہ میں ان کو لکھنے سے قاصر ہوں۔ ان میں صرف ایک ایسا ہے جس کو نقل کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے تیغ صاحب سے کہا کہ کلیجی کھایا کرو۔ یہ بات سیگمنٹ فرائڈ نے اپنی کتاب میں لکھی ہے اور ہیولاک ایلس نے اپنی محبوبہ کو پیار کرتے وقت کہی تھی۔

یہ سب اپنی جگہ تھا لیکن جب وہ تدریس میں آئے تو ان کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ طالب علم نصابی معلومات میں دل لگا کے کوشش کرے، امتحان میں اچھے نمبر لائے۔ وہ پورے چالیس منٹ ٹہل ٹہل کے پڑھاتے تھے اور نویں درجے اور میٹرک کے طالب علموں کو خصوصیت سے بڑی توجہ سے پڑھاتے تھے۔ اسی سال یادگار حسینی اسکول کو منظوری ملی تھی اور پہلا بیچ امتحان دینے جا رہا تھا۔ بحیثیت مدرس وہ بڑی اچھی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے سارے شاگرد ان کا نہ صرف احترام کرتے تھے بلکہ ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔

جب ہم لوگ رات میں اکٹھا ہوتے اور گپ لڑاتے تو اس وقت اکثر ان سے یہ سوال ہوتا کہ بھئی تم لڑکوں کو بھی کیا اپنی حس مزاح سے محظوظ کرتے ہو؟ تو وہ کہتے تھے: تدریس ایک عبادت ہے۔ اگر آپ اس پیشے میں آتے ہیں تو پھر اسی طرح اس کے ہر رکن کو بجا لائیے جیسے نماز نہیں ہو سکتی اگر آپ کی سمت نہیں درست ہے یا آپ کسی رکعت میں سورۂ حمد نہیں پڑھتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ وہ اس طرح کی باتیں اکثر کرتے تھے کہ آدمی کا ذہن چکرا کے رہ جاتا تھا۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو لوگوں کا دلچسپ انداز میں مضحکہ اڑاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ انہوں نے اپنے انداز سے لوگوں کا نام رکھا تھا۔ مثلاً ایک صاحب تھے۔ ان کا نام بدرالدین تھا انہوں نے ان کے نام کے آگے ٹھسّن کا لاحقہ لگا دیا تھا۔ ہوا کہ بدر الدین صاحب ہم لوگوں سے کسی نہ کسی بہانے سے کچھ نہ کچھ چرندم قرندم کر لیا کرتے تھے مگر خود کبھی ایک پیسہ نہیں خرچ کرتے تھے۔ اسرار نے جب انہیں ٹھسّن کہا تب بھی ان کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ ایک روز ہم سب لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بدر الدین خوش خوراک بھی تھے اور سب سے زیادہ خوراک بھی تھی۔ وہ کھاتے جا رہے تھے، اچانک ہم لوگوں نے دیکھا کہ اسرار نے پلنگ سے جست کی اور دور جا کر کھڑے ہو کے ہانپنے لگے۔ سب لوگ گھبرا گئے۔ پوچھا: کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کہنے لگے۔ دیکھ نہیں رہے ہو! میں ڈرا کہ اب کھانا تو ختم ہو جائے گا اس کے بعد یہ مجھے کھا جائے گا تو جان بچانا واجب ہے۔

ایک روز یہ طے کیا کہ جب بدرالدین سو جائیں تو ان سے انتقام لیا جائے۔ چنانچہ گرمی کا زمانہ تھا۔ پورے چاند کی رات تھی۔ انہوں نے تجویز پیش کی۔ عباس حسینی صاحب، جمال صاحب، اسرار اور یہ خاکسار۔ چاروں آدمی مل کے اور ایک مضبوط خادم ساتھ میں۔ بدرالدین کی چارپائی اٹھالی۔ حسن منزل کا آخری کمرہ جہاں ختم ہوتا ہے۔ اس سے متصل قبرستان ہے۔ ہم لوگ یہ چارپائی اٹھا کے چلے۔ اب یہاں سے بدرالدین کا بیان ہے کہ آنکھ کھلی تو دیکھا چاند چمک رہا ہے اور اس کی کرنیں قبرستان کی قبروں پر پڑ رہی ہیں۔ ایک بالکل تازہ قبر جس پر پانی چھڑکا گیا ہے اور اس پر سفید چادر پڑی ہوئی ہے۔ وہ دکھائی دے رہی ہے اور میرا پلنگ ہوا میں تیر رہا ہے۔ ان کو یہ یقین ہوا کہ انہیں دفنایا جانے والا ہے۔ انہوں نے ایک بڑے زور کا نعرہ لگایا۔ ہائے ماڈ ڈالا! اور ہم سب لوگ پلنگ چھوڑ کر بھاگے۔ بدرالدین ہاتھ میں ڈھیلا لئے ہوئے چاروں طرف پتھر پھینک رہے تھے۔ جب ان کی سنگ باری تھمی تب ایک ایک گوشے سے ہم لوگ نکلے اور اسرار ان سے پوچھنے لگے: ارے بھئی! کیا ہوا؟ کیوں تم اتنی زور سے چلائے؟ کہنے لگے: ارے مجھے مار ڈالا تھا لوگوں نے اور زندہ درگور کرنے جا رہے تھے۔ اسرار نے بڑے افسوس اور حسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: آئے ہائے! اور اس کے بعد بھی تم بچ گئے۔

ان کو اس کا بھی شوق تھا کہ لوگوں کو خطاب دیں جیسے بدرالدین ٹھسّن تھے، ویسے ہی ایک صاحب تھے جو حلق سے آوازیں نکالتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے غرارا کر رہے ہوں۔ ان کا نام غرچک رکھا تھا۔ ایک صاحب تھے وہ کھاتے تھے اور بھول جاتے تھے۔ جب ان کو ٹوکا جاتا تھا تو بڑی معصومیت سے کہتے تھے: ارے یارو! ابھی تو پہلا نوالہ ہے۔ وہ عموماً بڑے نوالے کھاتے تھے۔ روٹیوں کا ایک پہاڑ ہوتا تھا جو سمٹ کے ایک دو روٹی تک محدود ہو جاتا تھا۔ انہیں بھچ خوں خوں کا خطاب دیا تھا۔ یہ خطابات تقسیم ہوتے تھے۔ حلقے میں گشت کرتے تھے اور پھر اس کی شہرت ہوتی تھی۔

اسرار بڑی معصومیت سے جسے خطاب دیتے تھے۔ اس سے پوچھتے تھے: اچھا! میں نے تو کچھ نہیں کیا.....!

یہ سب ان کا انداز تھا۔ یہ باتیں ۱۹۵۲ء تک کی تھیں۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے۔ میں ۱۹۶۰ء میں جب پاکستان گیا تو اس وقت وہ تندرست تھے۔ صرف تمباکو ذرا زیادہ کھاتے تھے اور سگریٹ Capstan کے تمباکو کا رول کر کے پیتے تھے۔ تقریباً ایک ہفتہ وہ تندرست رہے پھر کراچی کا مرطوب موسم اور اسی کی ایک شام تھی جب وہ مجھے ساتھ لے کے کلفٹن گئے اور وہیں ہم دونوں کھڑے ہو کے سمندر کی لہروں کا مدوجزر دیکھتے رہے۔ اچانک انہوں نے کہا: یار! اب گھر چلو! میں نے کہا: چلو۔ مگر اتنی الجھن کیوں ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں! بہت وقت ہو گیا ہے اور

کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔تو میں نے کہا: ٹھیک ہے۔تم جاؤ۔ میں ابا کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہ ناظم آباد جی ۲ میں رہتے تھے اور میں گولی مار میں۔

انہوں نے کہا: نہیں! نہیں! چلو۔ ہم لوگ آئے اور پھر سونے چلے گئے۔ صبح چائے اور ہلکے ناشتے کے بعد وہ میرے پاس بیٹھے رہے لیکن نہ ان میں وہ پہلے کی گرم جوشی تھی اور نہ ہی وہ حس مزاح۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنے بائیں پیر کو رگڑتے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: کیا کوئی تکلیف ہے؟ انہوں نے پلکیں اٹھائیں۔ مجھے عجیب انداز سے دیکھا اور پھر چونک کر کہا: نہیں! نہیں!

اس دن کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ابا آئے تو انہوں نے کہا کہ گھر چلو! انہوں نے ابا سے کہا کہ ارے رہنے دیجئے ابھی دو ایک دن۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے! مگر جانا تو ہے ہی۔ میں نے کہا کہ میں پھر آ جاؤں گا۔ وہ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ میں چلا گیا۔ پھر ابا کے پاس دو تین دن رہا پھر میں لاہور، پنڈی اور پھر پشاور اپنی بہنوں کے پاس بھائی کے ساتھ گیا۔ یہاں تک کہ ویزا کی مدت ختم ہو گئی۔ پھر کراچی آیا تو اسرار کے پاس گیا، ملے، لیکن یہ معلوم ہوا کہ علیل ہیں۔ علالت کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔ اس درمیان انہوں نے لکھنا قطعی بند کر دیا تھا۔ ڈیڑھ متوالے، موت کی آندھی وغیرہ کا اشتہار کو جاسوسی دنیا میں جا رہا تھا لیکن ان کا مسودہ نہیں جا رہا تھا۔ میں ہندوستان آ گیا۔ ظاہر ہے کہ میرے پیش نظر ادارہ کو چلانا دو سبب سے ضروری تھا۔ ایک تو یہ کہ خود میرا اور میرے اہل وعیال کا رزق بھی اس سے وابستہ تھا۔ دوسرے جو ادارے کے متوسلین تھے ان کی اخلاقی ذمہ داری بھی میں محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کے خود لکھنا شروع کیا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جاسوسی دنیا ہندی جو اسرار کے زمانے تک چودہ ہزار پر اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت بڑھتی گئی یہاں تک کی جب میں نے اس میں لکھنا بند کیا ہے تو اس کی اشاعت چالیس ہزار ہو چکی تھی۔

یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے جاسوسی دنیا کی مقبولیت میں بیشک ابن صفی کی ناول نگاری کو دخل تھا لیکن کچھ پہلو اور بھی تھے جن کا ذکر نہ کرنا انصاف کے منافی ہوگا۔ پہلی بات تو اس کی پبلسٹی یا تشہیر تھی جو مختلف طریقوں سے کی گئی۔ دوسری بات اس کی پیشکش تھی یعنی اعلیٰ کاغذ، موتی کی طرح ٹکی ہوئی کتابت۔ اس کا سرورق جاسوسی دنیا کے ایک نمبر کے لئے سرورق ناگپور کے شکتی آفسیٹ میں چھپا تھا اور اس پر وارنش تھی۔ کتاب کی دکانوں پر وہ دور سے چمکتا ہوا نظر آتا تھا۔ بہت سارے لوگ صرف جاسوسی دنیا کی ایجنسی لے کے کافی فارغ البال ہو گئے تھے۔

ایک صاحب نے اپنا نام ابّن صفی رکھا تھا۔ ان کے خلاف مقدمہ چلا، انہیں سزا ہوئی لیکن انہوں نے غیر مشروط معافی نامہ داخل کیا۔ محمد درویش خاں نامی ایک صاحب نے جاسوسی دنیا کی نقالی کی۔ مقدمہ چلا، انہوں نے بھی معافی نامہ داخل کیا۔ ان سب کی پبلسٹی بہت مضبوط طریقہ سے اور سائنٹفک انداز میں کی گئی جس کا نتیجہ جاسوسی دنیا کی بڑھتی ہوئی اشاعت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بہت سارے لوگوں نے جاسوسی دنیا کی وجہ سے اردو سیکھی۔ اکثر جگہوں پر یہ ہوتا تھا کہ ایک آدمی پڑھتا تھا اور پانچ چھ عورتیں حلقہ بنا کے بیٹھ جاتی تھیں اور وہ سنتی تھیں۔ جاسوسی دنیا کے ایک ناول میں ایک ایسا منظر تھا جس میں فریدی خودکشی کرنے جا رہا تھا۔ اس وقت کچھ سجدہ میں گر گئے تھے اور یہ دعا کر رہے تھے کہ وہ بچ جائے۔ ان تمام باتوں کی تشہیر پورے ملک میں ہوتی تھی۔ جاسوسی دنیا ڈھاکہ میں شمیم بک ڈپو اور پشاور اور لاہور میں دیوان چند کے ذریعہ سے فروخت ہوتی تھی اور یہ لوگ اس کی ہر ممکن تشہیر کرتے تھے۔ اس لئے کہ زیادہ فروخت میں ان کو بھی فائدہ تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے نکتے اسرار کی پوری تصویر بنانے میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔

جتنے عرصے اسرار بیمار رہے۔ جاسوسی دنیا اردو نہیں نکلی۔ ہندی ہی نکلتی رہی۔ اردو میں بھی لاشوں کا آبشار، مصنوعی ناک، برف کے بھوت، بھیانک جزیرہ ناولوں میں میں نے دخل اندازی کی جس پر اسرار کافی برہم ہوئے تھے اور پھر میں نے دخل نہیں دیا۔ ایک بات ہمیشہ رہی اور وہ یہ کہ آنے والے ناول کا نام نوے فیصد میں ہی رکھتا تھا اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے پاکستان جانے کے بعد صرف میرے ہی ناول اسرار پبلی کیشن سے شائع کئے اور عباس بھائی کو ایک خط میں مجھے گالی سے سرفراز فرماتے ہوئے لکھا کہ وہ یہاں خوب چلتا ہے۔

جب میں پہلی بار پاکستان گیا تو کچھ ہی دن کے بعد وہ بیمار ہو گئے تھے اور جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو وہ ایک بہت بڑے تھیلے میں سوجی کا حلوا قاشوں میں اور چنے کا حلوہ لیکے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ پھر اس کے بعد دوسری بار جب میں پاکستان گیا تو وہ مکمل بیمار تھے اور میں بھی اپنے والد صاحب کی بیماری کی وجہ سے بیحد پریشان تھا۔ اس لئے ہم لوگ زیادہ نہیں مل سکے۔ ایک دوسرے کی غلام کبریا ناروی کے ذریعہ سے خبر گیری کرتے رہے۔ پھر میں الہ آباد آ گیا تھا اور ۱۹۶۵ء میں جب میں نے ادارۂ نکہت سے علیٰحدگی اختیار کی تو اسرار تندرست ہو چکے تھے اور انہیں حکیم اقبال حسین کے علاج سے فائدہ ہوا تھا۔ انہیں کے نام انہوں نے اپنی کتاب معنون بھی کی تھی۔ ان کے سلسلہ کا ایک جشن بھی ادارۂ نکہت میں منایا گیا تھا۔ جس میں ڈیڑھ متوالے کا افتتاح آنجہانی لال بہادر شاستری نے فرمایا تھا۔

یوں تو ان کا ہر ناول اپنی جگہ پر بیحد مقبول اور کامیاب سمجھا گیا لیکن ان کے کچھ ناول ایسے ہیں جو ادب عالیہ میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان میں لاشوں کا آبشار، خوفناک ہنگامہ، موت کی آندھی،

دشمنوں کا شہر اور عمران کے ناولوں میں لڑاکوں کی بستی قابل ذکر ہیں۔

ان کے مستقل کرداروں سے ہٹ کر ڈاکٹر نارنگ اور نادر شاہکار حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً 'دشمنوں کا شہر' کا نادر کو کوئی فراموش نہیں کرسکتا۔

ان تمام باتوں کے بیچ یہ لکھنا بہت ضروری ہے کہ ان کے جو خطوط آتے تھے وہ بیحد دلچسپ، لطیف اور مغلظات سے بھرے ہوئے ہوتے تھے اور ایک ایک لفظ سے محبت اور وابستگی ظاہر ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے ۱۹۵۹ء کے آغاز میں میرے ایم اے پاس کرنے پر پانچ سو روپئے انعام دیا تھا۔ اس لئے کہ فیلکٹی آف آرٹس میں میری پہلی پوزیشن آئی تھی اور مجھے طلائی تمغے ملے اور رکارڈ قائم کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے بیحد حوصلہ افزائی کی اور مجھے یاد دلایا کہ میں نے تم سے ۱۹۴۹ء میں کہا تھا کہ میں نے پڑھائی چھوڑ دی۔ تم مت چھوڑو۔ ایم اے کرو۔ تم بڑے اچھے لیکچرر ہوگے کسی یونیورسٹی میں مگر یہ یاد رکھنا کہ اپنی طرح سے لڑکوں کو نقل نہ کرانا۔ پڑھ لکھ کے پاس ہوں۔ میں نے خود اپنا ادارہ ۱۹۶۶ء میں قائم کیا لیکن کاغذ کی قلت اور خود میرے پاس سرمائے کی عدم موجودگی۔ چنانچہ مجھے جی ای سی فیکٹری میں بھی ملازمت کرنی پڑی اور میں نے بعد میں لال محمد بیڑی ورکس میں بھی کام کیا اور پھر مجھے سی ایم پی ڈگری کالج میں لکچرری مل گئی۔ پھر الٰہ آباد یونیورسٹی آیا، حیدرآباد گیا اور حیدرآباد یونیورسٹی میں ریڈر اور پروفیسر ہوا۔ اس پورے عرصہ میں اسرار میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ کسی موقع پر بھی انہوں نے یہ مشورہ نہیں دیا کہ میں اپنے قدم پیچھے ہٹا دوں۔ رسماً ایک بار ضرور لکھا تھا: تم مل جاؤ تو اچھا ہے۔

انہوں نے اسی زمانے میں میرا خاکہ لکھا جو رومانی دنیا کے ڈائمنڈ جبلی نمبر پھول اور انگارے میں شائع ہوا۔ انہوں نے میرے علاوہ کسی کا خاکہ نہیں لکھا البتہ انہوں نے کراچی میں نئے افق کے عنوان سے ایک رسالے کی سرپرستی کی تھی اور اس میں کبھی کبھی لکھا بھی کرتے تھے۔

۱۹۸۰ء میں جب میں حیدرآباد میں تھا اور کلاس میں جانے کی تیاری کررہا تھا تو محمد کلیم الحق قریشی جو طالب علم تھے، انہوں نے مجھے یہ منحوس خبر سنائی کہ اسرار ابن صفی کا انتقال ہوگیا۔

میں نے اپنے شاگردوں سے یہ سنا کہ جیسے ہی انہوں نے اپنی خبر کا آخری فقرہ تمام کیا تھا، میں چکرا کر گر پڑا اور مجھے لڑکوں نے سنبھال لیا تھا۔

بہرحال! پانی کا چھینٹا وغیرہ دیا گیا۔ ان کا لڑکا میرے پاس آیا۔ میں یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ وہیں میں نے ۱۰۴ ڈگری بخار کے عالم میں مضمون لکھا یا جس کا عنوان تھا۔ 'ستارہ جو غروب ہوگیا، روشنی جو باقی رہے گی'

یہ مضمون پہلی بار روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد کے ضمیمہ میں میری اور ان کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد شاید بارہ تیرہ بار مختلف جگہوں سے شائع ہوا۔

یہاں تک وہ شخصی تعلقات تھے جو ہمارے بیچ میں ماہ وسال کی گردش میں پیدا ہوئے تھے۔ اب تھوڑا سا ذکر جاسوسی دنیا اور ان کی ناول نویسی کے بارے میں کرنا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے بے تحاشہ داستانیں پڑھی تھیں اور اس کا اثر بھی قبول کیا تھا۔ چنانچہ جو کہانیاں وہ لکھا کرتے تھے۔ اس کی زبان بہت ہی سلیس اور بہت رواں ہوتی تھی۔ ان میں حس مزاح بیحد تھی۔ کسی کا بے تکا پن بھی ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور وہ اس کا مضحکہ اڑانے سے باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے جو کردار خلق کئے تھے ان کے پیچھے افراد تھے مثلاً قاسم کا کردار ہم لوگوں کے ایک دوست عبدالخالق کی شخصیت کی پرچھائیں تھا۔ ایک بنگالی صاحب تھے جن کا نام تھا دیجو بابو۔ انہوں نے اپنے گھر ہم لوگوں کی دعوت کی تھی۔ چونکہ وہ بنگالی تھے اس لئے رس گلے کا خاص اہتمام تھا۔ خالق نے پانچ رس گلے لگاتار غٹا غٹ کھالئے۔ اسرار کو بڑی حیرت ہوئی۔ کہنے لگے کہ ارے کیا دیکھ رہے ہو؟ اور کھاؤ گے کیا؟ خالق نے کہا: ہاں! مگر پیسہ دو۔ اسرار نے یہ سوچا کہ اب کیا کھائے گا۔ کہنے لگے: سنو! اب فی رس گلا آٹھ آنا۔ پانچ رس گلے تک۔ اس کے بعد ایک روپیہ فی رس گلا پانچ رس گلے تک اور اس کے بعد پانچ روپیہ فی رس گلا۔ خالق نے نہایت ناگوار منھ بنایا اور اس کے بعد وہ پانچ تو پہلے کھا ہی چکے تھے۔ مزید پانچ کھائے اور کہا: ڈھائی روپیہ دو۔ اب ہم لوگوں نے بھی کہا کہ جب کہا ہے تو دو۔ اسرار نے ڈھائی روپیہ دیا۔ خالق نے پھر پانچ کھائے اور کہا: پانچ روپیہ دو۔ پھر اسرار کے اوپر ہم لوگوں نے دباؤ ڈالا اور ان کو پانچ روپیہ دینا پڑا۔ خالق نے مزید پانچ کا اعلان کیا۔ اسرار نے فریاد کی: ابے! مرے گا کیا؟ خالق نے کہا: ہاں! ہاں! مروں گا۔ میری قبر میں رس گلا رکھوا دینا۔ اسرار نے کہا: قبر میں کیا کرے گا؟ خالق نے کہا: کچھ خود کھاؤں گا۔ کچھ فرشتوں کو کھلاؤں گا۔ خوش ہوجائیں گے۔

اسی طرح کی ہنگامہ آرائیاں اور عرف عام میں ایکٹیوٹی الٰہ آباد تک ہی محدود رہی۔ وہ اگست ۱۹۵۲ء میں محبوب کی ٹیکنکلر فلم 'آن' ہم لوگوں کے ساتھ دیکھنے کے بعد دوپہر میں چلے گئے اور ۱۵و ۱۶ حسن منزل عباس بھائی کو دے گئے جس میں انہوں نے مہمان خانہ قائم کردیا تھا۔ وہاں سے ان کے خطوط بھی آتے تھے۔ مسودہ بھی آتا تھا۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ان کا کوئی خط یا کچھ خطوط آپ لوگوں کے مطالعہ کے لئے پیش کروں مگر معاملہ ان جاسوسی نگار کا ہے اس لئے تجسس برقرار رکھنا ہے۔ پھر کسی موقع پر میں اسی مضمون کا ضمیمہ جو تتمہ ہوگا، خطوط کے ساتھ پیش کر دوں گا۔

بہر حال! ان میں کوئی خط ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں کوئی نہ کوئی ادبی رخ نہ ہو اور کہیں نہ کہیں مزاح کی چٹکی نہ ہو۔

ایک بات بتانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان کے جاسوسی دنیا کے مشہور کردار فریدی، حمید، قاسم، انور، رشیدہ ان سب منظر میں کوئی نہ کوئی شخصیت ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی شخصیت کے کسی ایک رخ سے متاثر ہوتے تھے اور پھر اسی تاثر کو قبول کر کے کردار کی شکل میں اس طرح ڈھالتے تھے کہ وہ ان کی اپنی تخلیق ہو جاتی تھی۔ مثلاً فریدی عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔ صرف غزالہ کے لئے کچھ نرم گوشے پُراسرار کنواں میں دکھائی دیتے ہیں۔ عباس حسینی صاحب کی شخصیت بہت وجیہہ، متاثر کن اور فریدی کی طرح تھی۔ وہ اپنی اہلیہ کے وفادار کیا بلکہ ایک طرح سے تابعدار تھے لیکن اس سے الگ ہٹ کے پھر کوئی خاتون انہیں متاثر نہ کر سکی۔ حالانکہ ان پر جان دینے والیوں میں ایک کملا صاحبہ تھیں جو مذہب تک تبدیل کرنے کو تیار تھیں اور ہم لوگوں کو کنوینسنگ کے لئے بھی ۱۹۵۴ء میں دو سو روپئے مہینہ دینے کے لئے راضی تھیں مگر عباس حسینی صاحب بالکل ہارڈ اسٹون ثابت ہوئے اور ہم لوگوں کا وہ پیسہ بھی مارا گیا۔

عباس حسینی صاحب میں اس کے علاوہ فریدی کی اور کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ انہیں سانپ سے کوئی دلچسپی نہیں تھیں بلکہ بہت ڈرتے تھے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی شخصیت بہت باوقار اور بارعب تھی۔

رشیدہ کا کردار ایک خاتون تھی جو سائیکل پر بیٹھ کے محلوں کا گشت کیا کرتی تھیں۔ ان کا سن شریف تیس برس تھا اور عام طور سے ہم لوگ انہیں 'لیڈی غنڈہ' کہا کرتے تھے اس لئے کہ دو ایک حضرات نے جب ان سے اظہار عشق کیا تو انہوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ اس اظہار عشق کرنے والے کو اپنے پاس بلایا اور جب وہ قریب آ گیا تو اپنا ہاتھ اس طرح بڑھایا جیسے اس کے گلے میں بانہیں ڈالنے والی ہوں مگر بانہیں نہیں پڑیں، گال پر ایک زبردست تھپڑ پڑا اور وہ غریب گال سہلاتا ہوا زمین دوز ہو گیا۔

انور کرائم رپورٹر ہے۔ ہم لوگوں کے گروپ میں ایسا کوئی آدمی نہیں تھا لیکن انور واحد آدمی ہے جو رشیدہ کو ٹھیک بھی کرتا رہتا ہے اور کبھی کبھی مرمت بھی کر دیتا ہے۔ ایسے ہی لیڈی غنڈہ کی مرمت کرنے والے ایک صاحب تھے جو چیو مہاراج کہلاتے تھے۔ اصل نام جلال العین تھا۔ وہ اس سے دوستی بھی رکھتے تھے اور اسے کنٹرول بھی کرتے تھے۔

علی عمران کا کردار انہوں نے خود اپنی شخصیت کے بعض گوشوں کو ملا کے خلق کیا تھا۔ مثلاً عمران کا پالتی مار کے بیٹھنا اور ماں کے ہاتھوں پٹنا اور دوسری طرف اس کا مجرموں کے ساتھ سخت رویہ۔ اسرار صاحب کا سخت رویہ کوئی مجرم تو ان کے اردگرد نہیں تھا لیکن ان کے بہت سارے دوست فلش کھیلتے تھے، تاش کے شوقین تھے۔ اسرار ایسے موقعوں پر ہٹ جایا کرتے تھے۔

اسی طرح قاسم کا کردار تو خالق کا تھا اور خالق جب موڈ میں ہوتے تھے تو پانچ چھ شیرمال کھا کے تو ند پہ ہاتھ پھیر کے ڈکار لیتے اور پھر یہ کہتے تھے: اے! تم لوگ کھانا کھاتے ہو یا چڑیا کا چارہ؟ کچھ دو چار شیرمال اور ہو گی؟

حمید کا کردار میرے خیال میں ان کے تمام کرداروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ان کے ایک دوست کا کردار ہے۔ یہ شخص بڑے مضبوط کردار کا تھا حمید ہی کی طرح مگر ظاہر یہ کرتا تھا کہ عورتوں کا رسیا ہے۔ یہ صفت اس میں فریدی کو چڑھانے کے لئے پیدا کی تھی۔ اس لئے کہ فریدی عورتوں سے بدکتا تھا۔ حمید ایک ایسا کردار ہے جو عالمی ادب میں ہمیشہ برقرار رہے گا۔

علی عمران کا کردار انہوں نے خود اپنی شخصیت کے بعض گوشوں کو ملا کے خلق کیا تھا۔ مثلاً عمران کا پالتی مار کے بیٹھنا اور ماں کے ہاتھوں پٹنا اور دوسری طرف اس کا مجرموں کے ساتھ سخت رویہ۔ اسرار صاحب کا سخت رویہ کوئی مجرم تو ان کے اردگرد نہیں تھا لیکن ان کے بہت سارے دوست فلش کھیلتے تھے، تاش کے شوقین تھے۔ اسرار ایسے موقعوں پر ہٹ جایا کرتے تھے اور بآواز بلند کہتے تھے: میں وہ شیعہ ہوں جو تم لوگوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اس میں لفظ 'تم لوگوں پر' خاص طور سے زور دیا جاتا تھا۔

سلام مچھلی شہری ہم لوگوں سے بہت قریب تھے۔ ان کے اندر ایک قبیح عادت یہ تھی کہ وہ شراب پی کے ہنگامہ کرنا دانشوری کی روایت سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسرار کے کلام کی بھی تعریف کی۔ ان کے طرزِ تحریر کو بھی سراہا، ان کی لکھی ہوئی کہانی کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر بھی کیا لیکن ان سب کے باوجود اسرار ان کی شراب نوشی سے سخت بیزار تھے اور ایک مرتبہ وہ نالی میں لیٹے ہوئے تھے اور چلا رہے تھے کہ مجھے نالی سے اٹھاؤ اور اسرار ان کے سامنے کھڑے ہوئے یہ کہہ رہے تھے: ابھی ابھی دو کتے اس نالی میں پیشاب کر کے گئے ہیں۔ میں تیسرے کی تلاش میں ہوں اور انہوں نے ان کو نہیں اٹھایا۔

وہ اس معاملہ میں بالکل پتھر دل تھے اور کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ اس طرح کی حرام کاریوں سے تو یقیناً وہ مبرا تھے لیکن مولویت نہیں تھی۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ پکچر بھی دیکھتے تھے، تفریحات میں برابر کے شریک رہتے تھے اور کسی حد تک حسن پرست بھی تھے۔ اس حسن پرستی پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے تقریباً ساڑھے تین شادی کی۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو دوسری شادی کی پھر تیسری ہوئی جب

دوسری نے اس دنیا سے کوچ کیا اور آدھی شادی یا آدھا معاشقہ ایک ایسی خاتون سے تھا جسے وہ افشاء بھی نہیں کر سکتے تھے اور چھپا بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک طرح سے وہ ان کی لیڈی سکریٹری تھی اور ہم لوگ اسے سکریٹرا کہتے تھے۔

اسرار ۱۹۵۲ء میں پاکستان گئے اور میں اپنے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں جاکے ان کی وہ تخلیقی صلاحیت جو تحریری تھی، وہ تو اپنی جگہ رہی لیکن اس سے الگ ہٹ کے جو متحرک اور فعال شرارتیں وہ کیا کرتے تھے وہ برقرار نہیں رہیں۔ کثرت سے پان کھانے لگے تھے جس میں تنبا کو ہوتا تھا۔ سگریٹ رول کر کے پیتے تھے۔ وقت کا کوئی تعین نہیں تھا اور اس میں شب بیداری بھی تھی۔ میں جب پاکستان گیا تو پہلی بار جب گیا تو میرے سامنے ہی وہ بیمار پڑے۔ بیمار پڑنے سے پہلے تک ان میں الہ آبادیت اور ناورویت عود کر آئی تھی مگر پھر بیماری نے ان کو توڑ دیا۔ دراصل وہ کئی امراض میں مبتلا ہو گئے تھے جس میں اعصابی خلل بھی شامل تھا اور حکیموں کی زبان میں ریاح باصوریہ کے مریض بھی تھے۔

بہرحال! ۱۹۶۲ء کے آغاز تک وہ تندرست رہے مگر اندر ہی اندر ان کی صحت کو دیمک لگ گئی تھی اور پھر انہوں نے قلم بھی رکھ دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء تک ان کے مسودے نہیں آتے تھے۔ کبھی کبھی خط بھی نہیں آتا تھا۔ ان کا علاج کراچی کے جتنے نامور ڈاکٹر تھے، سب نے کیا اور ناکام رہے لیکن پھر وہ حکیم اقبال حسین کے علاج سے شفایاب ہوئے اور انہوں نے قلم اٹھایا مگر سچ بات یہ ہے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد کے ناولوں میں وہ نشتریت اور تیکھا پن کم ہو گیا تھا اور ان کی مقبولیت بھی متاثر ہوئی تھی۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ پہلے سے بک کرا لیتے تھے۔ اکثر گھروں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ ایک بہت بڑے پروفیسر لیکچر دینے آتے تھے تو ان کے پاس جاسوسی دنیا کا تازہ شمارہ پایا جاتا تھا۔ گھر پر اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ ان کے بچے اسے پڑھنے لگتے تھے اور اپنی ساری کتابیں چھوڑ دیتے تھے۔ ان کی مقبولیت کا مٹی، ناگپور، چھندوارہ میں تھی اور جب میں ان علاقوں میں گیا اور میں نے اپنا تعارف کرایا تو لوگ اتنے احترام وعقیدت سے مجھ سے ملتے تھے جیسے میں کوئی پیر ہوں اور اس کا سبب یہ

۱۹۶۲ء کے آغاز تک وہ تندرست رہے مگر اندر ہی اندر ان کی صحت کو دیمک لگ گئی تھی اور پھر انہوں نے قلم بھی رکھ دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء تک ان کے مسودے نہیں آتے تھے۔ کبھی کبھی خط بھی نہیں آتا تھا۔ ان کا علاج کراچی کے جتنے نامور ڈاکٹر تھے، سب نے کیا اور ناکام رہے لیکن پھر وہ حکیم اقبال حسین کے علاج سے شفایاب ہوئے اور انہوں نے قلم اٹھایا مگر سچ بات یہ ہے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد کے ناولوں میں وہ نشتریت اور تیکھا پن کم ہو گیا تھا اور ان کی مقبولیت بھی متاثر ہوئی تھی۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ پہلے سے بک کرا لیتے تھے۔ اکثر گھروں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ ایک بہت بڑے پروفیسر لیکچر دینے آتے تھے تو ان کے پاس جاسوسی دنیا کا تازہ شمارہ پایا جاتا تھا۔ گھر پر اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ ان کے بچے اسے پڑھنے لگتے تھے اور اپنی ساری کتابیں چھوڑ دیتے تھے۔

بیان کرتے تھے کہ ابن صفی نے آپ کا خاکہ لکھا اور آپ ان کے دوست ہیں اور ہم لوگ جب خط لکھتے ہیں تو وہ کبھی اگر جواب دیتے ہیں تو اس میں آپ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ ابن صفی کی مدح میں جاسوسی دنیا کے دفتر میں روزانہ بلا مبالغہ دس پندرہ خط آتے تھے۔ اس طرح ایک شمارے سے دوسرے شمارے کے درمیان چار پانچ سو خط آجاتے تھے۔ ایک آدمی اسی پر تعینات تھا کہ خطوط کو منتخب کر کے دے لیکن بہت کم اس کی اشاعت کی نوبت آتی تھی۔ ان کی مقبولیت سحر انگیز تھی اور اردو میں تو کیا کسی بھی زبان میں کسی مصنف کی اتنی توقیر نہیں ہوئی۔ بیشک اگاتھا کرسٹی یا ایڈگر ویلس کی کتابیں زیادہ چھپتی تھیں، زیادہ فروخت ہوتی تھیں لیکن اس کا سبب اور بھی تھا جس میں انگریزی زبان کی وسعت اور لوگوں کی قوت خرید تھی۔ اردو ہندی پڑھنے والے مانگ کے اور کلب بنا کر کے پڑھ لیا کرتے تھے۔

اسرار کا کھانے میں سب سے پسندیدہ کھانا کباب، بھنے ہوئے تکے، مرغ کے تلے ہوئے پارچے غرض کہ بھنی ہوئی اور تلی ہوئی چیزیں بہت پسند کرتے تھے اور میرے یہاں کھڑے مسالے کا گوشت ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ چنانچہ اکثر رات میں گیارہ بجے وہ اس کی فرمائش کرتے تھے اور ساڑھے بارہ بجے نوش فرماتے تھے۔ ہر اچھی چیز پسند کرتے تھے اور مونگ کی کھچڑی سے سخت پرہیز کرتے تھے یہاں تک کہ علالت کے زمانے میں ڈاکٹر نے اس کا مشورہ دیا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں گھر جاکے زہر کھالوں گا اس لئے کہ مونگ کی کھچڑی یا مونگ کی دال سے وہ زیادہ لذیذ ہوگا۔ ان کی پسندیدہ ڈشوں میں وہ کچھ چیزوں سے گھبراتے تھے۔ مثلاً لوکی یا ٹنڈے کی ترکاری۔ کراچی جاکے ان کی پسند میں یقینا تبدیلی آئی تھی اس لئے کہ کراچی میں ملیر سے ترکاریاں آتی تھیں مگر وہ بات کہاں۔ وہاں کی زمین ہی میں وہ تاثیر نہیں تھی جس سے لذت پیدا ہو۔ خضر واۃ الہندیہ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے اور کبھی کبھی خود اس کو پکانے کے عزم کا اظہار کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کڑھائی بھی فریاد کرتی تھی اور پتیلی بھی گریہ کرتی تھی۔

ان کا نصابی علم تو زیادہ نہ تھا۔ بی اے پاس تھے وہ بھی بڑی مشکل سے لیکن انہوں نے انگریزی ادب کا اچھا خاصہ مطالعہ کیا تھا۔ لکھنے والوں میں وہ

سب سے زیادہ رائیڈر ہیگرڈ سے متاثر تھے اور ان کا ناول 'خونی بگولے' اور 'پہاڑوں کی ملکہ' اسی سے متاثر ہے۔ وہ نفسیات کے بڑے اچھے طالب علم تھے۔ مصطفی زیدی صاحب کو فرائڈ کو تو پڑھانے ہی لگتے تھے ساتھ ہی ساتھ وہ انگریزی کے شعراء مثلاً کیتھس، شیلی، بائرن کے بارے میں بھی اظہار خیال کرنے سے نہیں باز آتے تھے۔ انہوں نے باضابطہ طور پر مرفی ووُڈورف کی نفسیات کی نصابی کتابیں بھی پڑھیں اور پڑھائی تھیں اور بحث مباحثہ میں بھی ان کے حوالے دیا کرتے تھے۔ وہ شدت سے مذہبی آدمی تھے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ نماز پابندی سے جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے لیکن رمضان شریف میں روزہ تو ضرور رکھتے تھے اور اگر نہیں رکھتے تھے تو احترام روزہ یقینا کرتے تھے۔ رمضان میں کبھی انہیں سگریٹ پیتے نہیں دیکھا گیا۔

میرا خیال ہے کہ سوائے میرے کسی سے مذہبی بحث نہیں کرتے تھے اور میں نے بحث میں یہ محسوس کیا تھا کہ وہ کوشش کرتے تھے کہ میں جھلاہٹ میں مبتلا ہو جاؤں اور میں انہیں مشتعل کرتا تھا لیکن سب سے شاندار بات یہ ہے کہ ہم دونوں کبھی نہ جھلائے نہ مشتعل ہوئے اور نہ تعلقات میں تلخی آئی۔ کتابوں کے حوالے دینے میں اکثر ان کی ذہنی رو بہک جاتی تھی اور خصوصاً مصطفی زیدی ان کا ٹارگیٹ بنتے تھے۔ لوئی دا باسٹر، والٹر براؤنڈی، ایسے نام تلاشتے تھے کہ جو کبھی نہ سنے گئے اور نہ ان کا کوئی وجود تھا اور کبھی کبھی جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ترکاریوں کے نام انگریز فلسفیوں کے نام پر رکھتے تھے اور مصطفی زیدی صاحب سے کہتے تھے: جاؤ میاں! ابھی مسٹر کیرٹ کو پڑھو، تم نے مس کیلی فلاور کی پوئٹری تو پڑھی ہی نہیں؟ اس طرح کی تفریحات ان کے مشاغل حیات کا جز تھیں۔ کراچی میں بیمار ہونے کے بعد یقیناً ان میں ذہنی اضمحلال آ گیا تھا۔ میں نے انہیں بیماری ہی کی حالت میں دیکھا۔ وہ نظریں اٹھا کے جب میری طرف دیکھتے تھے تو اس میں ایک بے بسی کی جھلک تھی۔ لیکن جب وہ تندرست ہو گئے (یہ عارضی وقفہ رہا) اسی زمانے میں دو برس بعد میں جاسوسی دنیا سے علیٰحدہ ہو گیا۔ میں نے خود اپنا کاروبار شروع کیا اور نہایت شاندار طریقہ پر ناکام رہا۔ اس حد تک ناکام رہا کہ میں نے فیکٹری میں ملازمت کی، مزدوری کی، بیڑی کمپنی میں کام بھی کیا اور قائم بھی کی اور آخر میں ڈگری کالج میں سروس ملی پھر میں یونیورسٹی میں آیا۔

جب میں یونیورسٹی میں آیا تب اسرار صاحب نے حوصلہ افزا کلمہ لکھنے کے بجائے کچھ محبت بھری گالیوں سے سرفراز فرماتے ہوئے لکھا: بیٹا! یہ تمہاری اصلی جگہ تھی۔ اب لگے رہو اور یہاں تم آگے بڑھو گے۔ چنانچہ جب میں نے ۱۹۷۹ء میں حیدرآبادی مرکزی یونیورسٹی میں چارج لیا تو انہوں نے مجھے پانچ صد (پانچ سو) روپئے بھجوائے اور اظہار مسرت کیا لیکن حیدرآباد پہنچنے کے بعد رابطہ تقریباً ٹوٹ سا گیا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ علیل ہیں اور پھر ایک روز یہ منحوس خبر ملی کہ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ دنیا فانی ہے۔ میں اپنے تاثرات کی میت اپنے ہی کاندھے پر اٹھائے ہوئے گولڈن تھریسولڈ یا سنہری چوکھٹ کے پھاٹک کو پکڑے کھڑا تھا اور اگر نہ سنبھالا جاتا تو شاید بیہوش ہو چکا ہوتا۔

آج تقریباً چالیس برس ان کے انتقال کو ہو گئے اور ساتھ چھوٹے تقریباً ۵۰ برس گزر گئے۔ میں حیدرآباد میں تھا۔ ان کا بیٹا بعد میں میرے پاس حیدرآباد آیا تھا اس لئے کہ انہوں نے اسے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ حیدرآباد ان کے انتقال کے بعد جائے۔ مجھ سے ملے اور مجھے تعزیت پیش کرے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ کس طرح میں نے حیدرآباد گیسٹ ہاؤس میں پرفیسر رحمت یوسف زئی کو روتے ہوئے مضمون لکھوایا تھا۔ ان کا بیٹا ابرار میرے ساتھ نم دیدہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ مل رہا تھا۔

آج بھی کبھی کبھی احمد صفی کا خط آ جاتا ہے۔ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں لیکن یادیں دوست بھی ہیں، جلاد بھی۔ کس بات کو یاد کروں، کس کو بھول جاؤں۔ آپ اگر بتا سکتے ہوں تو بتا دیں۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

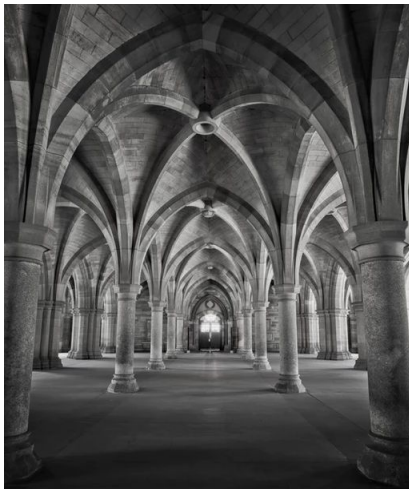

کاش کھل جاتے ذرا ابن صفی کے اسرار

پروفیسر عباس رضا نیّر

صدر شعبۂ اردو،
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

رابطہ: 9919785172

اپریل ۱۹۲۸ء کا کوئی جمعہ تھا جب الٰہ آباد کے قصبہ نارہ میں داغ اسکول کے نمائندہ شاعر نوح ناروی کے بھتیجے کی شکل میں اسرار احمد ناروی نے آنکھیں کھولیں۔ زمیں داروں کا یہ قصبہ علم، ادب اور تہذیب ہی نہیں اپنے تفریحی مشاغل کے اعتبار سے بھی مالا مال تھا۔ مکتبی اور نصابی تعلیم کے ساتھ اس وقت وہاں کے بچے جب گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلنے میں محو رہتے تب اسرار احمد کے ہاتھوں میں 'طلسم ہوش ربا' کی جلدیں نظر آتیں یا جگر مرادآبادی کی غزلوں کے پرچے۔ انہیں دنوں میں رائیڈر ہیگرڈ کی داستانیں اور ترقی پسند شاعروں کی نظمیں بھی کبھی کبھی اسرار احمد کے ذہن و دل پر دستکیں دے دیا کرتیں۔ یقین کیجئے، بچپن کے انہیں دنوں میں اسرار احمد کی کہانی 'ناکام آرزو' نہ صرف یہ کہ عادل رشید کے ہفت روزہ رسالے 'شاہد' میں شائع ہو چکی تھی بلکہ اسرار احمد کوئی بزرگ مصور جذبات کی حیثیت سے بھی جانے جانے لگے تھے لیکن کبھی خود اسرار احمد کو یہ کشمکش ستانے لگی کہ اس وقت اردو زبان و ادب کی دنیا میں اپنی دکان چمکانے کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ جنسی کہانیاں یا احتجاجی شاعری۔

اسرار احمد کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ یہ کشمکش بھی بڑھتی رہی کہ اس وقت ایک نئے لکھاری کو اپنی شناخت قائم کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں؟ انہیں خارجی اور داخلی کشاکشوں کے درمیان اسرار احمد نے طغرل فرغان کے نام سے کئی طنزیہ تحریریں بھی لکھ ڈالیں جو علی عباس حسینی کے رسالے 'نکہت' میں شائع ہوئیں۔ اس زمانے میں 'نکہت' کے حصہ نثر ادارت سید مجاور حسین رضوی کرتے تھے جنہوں نے ابن سعید کے نام سے بے تحاشہ رومانی ناول لکھے لیکن آگے چل کر اپنے اصلی نام کے ساتھ ہی ایک دیدہ ور نقاد، عہد ساز دانشور اور مثالی پروفیسر کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ اللہ انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ ابھی تک ان کا فیضان ادب جاری و ساری ہے۔ پروفیسر سید مجاور حسین رضوی کے ساتھ ہی 'نکہت' کے حصہ نظم کی ادارت خود اسرار احمد کرتے تھے۔ انہیں دنوں وکٹر گن کا نال 'آئرن سائیڈ رلون ہینڈ' اسرار احمد کے ہاتھ لگ گیا۔ جس کی کہانی کو بنیاد بنا کر اسرار احمد نے فریدی اور حمید جیسے کردار بنا ڈالے۔ اپنے اس پہلے ناول 'دلیر مجرم' کے ساتھ ہی اسرار احمد ابن صفی ہو گئے۔ ابتدائی ساتھ آٹھ ناول تو ابن صفی نے انگریزی ناولوں سے اٹھائے لیکن پھر ہر مہینے ایک طبع زاد جاسوسی ناول لکھنے لگے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اپنی بے پناہ عوامی شہرت ومقبولیت کی چمک دمک میں بھی ابن صفی نے اپنے اندر کے اسرار ناروی کو مرنے نہیں دیا۔ ایک جاسوسی ناول نگار اپنے اندر کے شاعر کو وقت دے سکا یا نہ دے سکا لیکن اس کی اہمیت سے وہ کسی وقت غافل نہیں رہا۔ اس حقیقت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے اردو زبان کی جو خدمت ابن صفی نے کر دی، وہ اردو کے بڑے بڑے ادارے بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے جاسوسی ادب نے ہندوستان اور پاکستان کی پوری ایک نسل کو اردو سیکھنے کے لئے مجبور کر دیا۔ انہیں جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے دنیا کے عیش وعشرت بھی ملے، مال ودولت بھی اور انعامات واعزازات بھی لیکن خود انہیں بھی یہ کسک بار بار ستاتی رہی کہ قبولیت عوام انہیں بقائے دوام نہیں دے سکے گی۔ حالانکہ ان کا جاسوسی ادب بھی کبھی مر نہیں سکے گا لیکن ان کی نظر میں بقائے دوام کا کینوس کچھ اس سے زیادہ وسیع تھا۔ وہ جانتے تھے کہ غلام ہندوستان میں انگریزی کے جن جاسوسی ناول نگاروں کا سکہ چلتا تھا خود ابن صفی کے سامنے لوگ ان مشہور ناول نگاروں کے نام تک بھول گئے تھے۔ ابن صفی جانتے تھے کہ اردو کا ادب عالیہ چند پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہے جب کہ ابن صفی کا ناول اردو بولنے والوں گھرانوں میں ہر تکئے کے نیچے پایا جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود میرؔ کی غزلوں اور اقبال کی نظموں والی دانشوری ان کے حصے میں نہیں آ سکتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے جاسوسی ناولوں کے ذریعہ جرائم کی دنیا کے اسرار دنیا پر ضرور کھول سکتے ہیں لیکن اس وسیلے سے وہ خود اپنے اسرار کے ذات حرم سے باہر نہیں نکل سکتے۔

ابن صفی تمام زندگی اپنے اندر موجود ایک بڑے شاعر کے احساس کے حصار میں محصور رہے۔ وہ اپنے موجود اسرار ناروی سے بار بار نظمیں بھی کہلواتے رہے اور غزلیں بھی۔ انہوں نے تقسیم پاکستان اور ہجرت سے پہلے 'آخری التجا'، 'دیوانہ' اور 'بانسری کی صدا' جیسی اہم نظمیں کہیں۔ نظم 'آخری التجا' ان پاک روحوں کے نام ہے جنہوں نے وطن پر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد شیر وشکر رہنے والے روس اور نازی جرمنی بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ دنیا کے حالات بہت تیز تبدیل ہوئے لیکن سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج نے میدان نہیں چھوڑا۔ ہندوستان کی زمین اپنے سپوتوں سے خون کا خراج مانگتی رہی اور ہندوستان کی بیٹیاں اپنا سہاگ اپنی مادر وطن پر قربان کرتی رہیں اور ہندوستان کے ویر اپنی سہاگنوں سے اس طرح رخصت ہوتے رہے:

گر راہِ وفا میں کام آؤں، سندور سے مانگ بھرے رہنا
بندی نہ مٹانا ماتھے کی تم میری راہ تکے رہنا
میں خواب میں اکثر آؤں گا سینے میں آس رکھے رہنا
اب چھوڑ بھی دو میرا دامن، للہ نہ روکو جانے دو

اسرار ناروی کی نظم 'دیوانہ' ان حالات کو پیش کرتی ہے جب ہندوستان کے کچھ لوگوں میں اپنوں سے غیریت کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ 'بانسری کی صدا' اسرار احمد کی نہایت دل آویز نظم ہے۔ بانسری جو مل کے بچھڑنے اور بچھڑ کے ملنے کا حسین ترین استعارہ ہے۔ بانس جو اپنی جڑوں سے بچھڑتا ہے تو محبوب کے لبوں سے ملتا ہے۔ بانسری کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی، یہ کبھی اپنے آپ نہیں بجتی بلکہ سارا کھیل بجانے والے کے لبوں اور انگلیوں کے لمس کا ہوتا ہے۔ یہ آواز بجانے والے کے ذہن وضمیر، قلب ودماغ اور ریاضت وعرفان کی آواز ہوتی ہے یعنی بانسری کی آواز خود انسان کی ذات کی بازگشت ہوتی ہے۔ یہ آواز گراں نہیں بلکہ لطیف ہوتی ہے جو سننے والے کی روح کو سکون عطا کرتی ہے۔ یہ بانسری ایک طرف شری کرشن جی سے وابستہ ہے تو دوسری طرف مولانا روم سے۔ کرشن جی بجاتے ہیں تو گوپیاں جمع ہو جاتی ہیں اور مولانا روم بجاتے ہیں تو اہل معرفت کا میلہ لگ جاتا ہے اور محبت کی لیلا شروع ہو جاتی ہے۔ اسرار ناروی بھی اس بانسری سے اپنے محبوب کا سراپا بیان کرتے ہیں۔ یہ بانسری انہیں کبھی ان کے محبوب کی چوڑیوں کی کھنک سناتی ہے کبھی پازیب کی جھنکار۔ کبھی پیراہن کی خوشبوئیں لاتی ہیں کبھی نغمگی سسکیاں لیکن آخرکار یہ سب کچھ ایک سراب حنا بن کر رہ جاتا ہے اور اسرار ناروی یہ کہہ کر اداس ہو جاتے ہیں:

مگر یہ کیف میں ڈوبا ہوا طلسم خیال
غم حیات کی آہٹ سے لوٹ جاتا ہے
انوکھے رنگ دکھاتا ہوا یہی فانوس
اندھیری رات سے ٹکرا کے لوٹ جاتا ہے

۱۹۵۲ء میں ابن صفی ہجرت کر گئے اور اس کے بعد وہ جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے بے پناہ مقبول ہوئے۔ جاسوسی ناولوں کا کینوس چاہے جتنا بڑا ہو جائے لیکن ان میں غم ذات بیان کرنے کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ چنانچہ ابن صفی کا غم اسرار ناروی اپنی نظموں میں بیان کرتے رہے۔

نظم 'کوئی بھی ہو غمگسار تو ہو' میں اسرار ناروی ایک لوح مزاح کی طرح تنہا اور خاموش کھڑے ہوئے رفاقتوں کی محرومیوں کا ماجرا بیان کرتے ہیں کہ میں بھی بس ایک قبر کی تختی کی طرح اس طرح اکیلا ہو جاؤں گا جس سے کسی کا کوئی تعلق نہیں رہ جائے گا۔ بالآخر تاریخ کا ایک گمشدہ ورق ہو کر رہ جانا ہی میرا بھی مقدر ہے۔ 'غنودگی' میں کچھ اپنی ذات کا کرب بیان کیا گیا ہے۔ نظم 'سوگ' ان حالات اور کیفیات کو پیش کرتی ہے جو ایٹم بم گرنے کے بعد دنیا میں پیدا ہوئے۔ یہ نظم ان مصرعوں پر تمام ہوتی ہے:

ہواؤ چیخو کہ اک چیخ دل خراش اٹھی
فضاؤ روؤ کہ انسانیت کی لاش اٹھی

علامہ اقبال کے بعد اردو کے متعدد شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے 'ساقی نامے' لکھے۔ نظموں

میں ہی نہیں غزلوں میں بھی ساقی اور ساقیہ جیسی ردیفوں کے استعاروں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ جگر مرادآبادی کا ساقی نامہ تو واقعی اپنے عہد کا شہرآشوب ہے۔ اسرار ناروی نے بھی اس سلسلہ میں ساقی نامہ تحریر کیا لیکن اس کی روح سرار مغربی، تکنیکی اور فینٹسی ہو کر رہ گئی۔ فرق یہ ہے کہ علامہ اقبال اپنی نظموں میں انگریزی تہذیب ونظام کو بدل دینے کا پیغام دیتے ہیں جب کہ اسرار ناروی مایوس و مجبور ہو کر ہار مان لیتے ہیں اور اپنا ساقی نامہ ان مصرعوں پر ختم کر دیتے ہیں:

اب گوارہ نہیں عذاب مجھے
زہر دے اب نہ دے شراب مجھے

واضح رہے کہ اسرار ناروی کی نظموں میں ابن صفی ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی طغرل فرغان کی بھی مراجعت ہوئی ہے۔ 'شکستِ طلسم' اسرار ناروی کی خوبصورت طنزیہ نظم ہے۔ شادی کے وقت میاں بیوی ایک دوسرے کے عارض ولب و رخسار کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے لیکن جلد ہی یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور بچوں کے بعد وہی تیل اور اچار کی باتیں رہ جاتی ہیں یا خالد و زید کے بخار کی فکریں۔ تب بیوی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر بڑا فنکار نہیں بلکہ گھر گرہستی کی فکر رکھنے والا ذمہ دار نظر آئے۔ منظر، کردار، جذبات، نفسیات اور واقعات کی خوبصورت تصویر کشی کرتی ہوئی اسرار ناروی کی نظم 'شکستِ طلسم' بیوی کے ان مکالموں پر مکمل ہوتی ہے۔

فن کو میں سر کی جوں، سمجھتی ہوں
کیسے برداشت تم کو اب میں کروں

اب آیئے! ایک نظر اسرار ناروی کی غزلیہ شاعری پر بھی ڈالتے ہیں۔ ان کی اکثر غزلیں مسلسل ہیں۔ جن کے اشعار آپس میں ہی ایک دوسرے کی تفہیم وتعبیر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھنے میں نظم کی قرأت کا لطف آتا ہے بلکہ خود اسرار ناروی کی نظموں سے زیادہ لطف آتا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں زیادہ تر اپنے عہد اور اپنے ماحول پر تنقید کرتے ہیں یا خود اپنی ہی ذات کے غموں کو بیان کرتے ہیں۔ اسی لئے میرؔ کا لہجہ انہیں زیادہ راس آتا ہے۔ کبھی کبھی کسک ہوتی ہے کہ کاش! اسرار ناروی کا ابن صفی انہیں تھوڑی مہلت دے دیتا اور وہ تھوڑا سا خونِ جگر غزلوں کو بھی دے دیتے تو اردو غزل کو ایک بڑا شاعر میسر آجاتا۔ ان کی ایک غزل سے ایک مطلع اور ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔

راہ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشکِ غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

بیشک، باوجود اس کے کہ پورا سماج اپنا ہے لیکن درحقیقت سبھی میں ایک طرح کی غیریت پائی جاتی ہے چونکہ سب کے سب خودغرض ہیں۔ سب کے سب صرف اپنے لئے جی رہے ہیں۔ کسی کو کسی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ سچائی یہی ہے کہ ہر انسان اپنے آپ میں تنہا ہے۔

غم زمانہ کا شکوہ کرتے کرتے اسرار ناروی جب غم ذات بیان کرنے لگتے ہیں تو غزل کا لہجہ دوآتشہ ہو جاتا ہے اور وہ لہجے کی نرمی کے ساتھ زندگی کے بڑے بڑے مسائل غزل کے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں بیان کر جاتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

اگر میں چپ ہوں تو سوچتا ہوں
کوئی تو پوچھے کہ بات کیا ہے

ملاحظہ کیجئے! اپنی اولاد، دوستوں اور قدردانوں سے یہ ایک سن رسیدہ فنکار کا شکوہ ہے۔ پوسٹ کلونیل سوسائٹی سے نکل کر پھر ایک خرد کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ ایک دانا جب اپنے آپ کو فنا کرتا ہے تبھی ساری کھیتی گلزار ہوتی ہے۔ ایک انسان جب اپنے آپ کو مٹا ڈالتا ہے تب اس کا خاندان اور اس کا قبیلہ کچھ حاصل کر پاتا ہے لیکن اپنے آنگن کو گھنی چھاؤں دینے والے برگد کا دکھ کوئی نہیں پوچھتا کہ سوا نیزے پر ٹھہرے ہوئے سورج کی دھوپ خود اس کو کس طرح جھلسا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے آج پوری ایک نسل آسائش حاصل کر رہی ہے۔ خود اس کے کرب کو محسوس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چونکہ سب کی حس مر چکی ہے۔ ایک اور غزل کا ایک مطلع اور ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

کیا ہے گر رخسار پر تل ہے
لمس کی لذت راحت دل ہے
قطرۂ خوں جو آنکھ سے ٹپکا
اپنی محبت کا حاصل ہے

یہاں دونوں شعروں کی کیفیت دیکھئے۔ رخسار کا تل آنکھوں کو حظ دیتا ہے اور لمس دل کو۔ دل کے جذبوں میں لمس سے جو ارتعاش پیدا ہو سکتا ہے وہ محض شربت دیدار اور قندِ سخن سے نہیں ہو سکتا۔ ظاہر کے اس حسن کو باطن کے جذبوں میں تبدیل ہونا چاہئے لہٰذا ضروری ہے کہ دلکشی دل جوئی میں بدل جائے۔ چونکہ بہرحال دلکشی میں تو یک طرفہ عمل ہوتا ہے جب کہ دلجوئی میں خود حسن بھی شامل ہوتا ہے۔ اگلے شعر میں آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے قطرۂ خوں کو محبت کا حاصل بتایا گیا ہے۔ یہ شعر واضح کرتا ہے کہ میرے لہجے کی اثر انگیزی میں گرفتار اسرار ناروی بھی کبھی غالبؔ سے بھی اکتسابِ فن کر لیتے ہیں:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

(بریکٹ) اور 'کاماز' کے ذریعہ بیانیہ اور مکالمہ کا فرق واضح کرنے والا ناول نگار کبھی کبھی نثری شاعری یا شعری نثر بھی لکھنے لگتا ہے جس کا لطف اس شعر سے لیا جا سکتا ہے:

(وہ کوئی حاکم دوراں تو نہیں)
مت ڈریں ان کی 'نہیں' سے ملئے

اپنے عہد کا المیہ بیان کرتی ہوئی ایک غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے:

دوسروں کو تو ہے لہو بھی شراب
اک ہمیں پر بھلا ہے کیوں یہ عتاب

وہ بھی نکلے تھے خلد سے آخر
ایک ہم ہی نہیں ہیں خانہ خراب

تشنگی کس مقام پر لائی
اب تو دریا بھی ہو گیا ہے سراب

کل جہالت تھی نادر و چنگیز
علم کی روشنی ہے آج عذاب

آلۂ قتل آج نوکِ قلم
آج کاغذ ہے قتل گہہ کا جواب

بیشک کل جو کام جہالت کیا کرتی تھی آج وہی کام علم کے نام پر ہو رہا ہے۔ آج ہمدردی کے نام پر ظلم اور انسانیت کے نام پر بربریت ہو رہی ہے۔ آج امن عالم کے نعروں میں لپیٹ کر دہشت گردی کا زہر تقسیم کیا جا رہا ہے۔

ابھی ہم نے دیکھا تھا کہ اسرار ناروی نے غالبؔ کے مضمون کو کس طرح سادہ اور سلیس انداز میں پیش کیا تھا۔ اب میرؔ کا ایک مضمون اسرار ناروی کے انداز میں دیکھئے:

گر رہا ہے تو کسی اور طرح خود کو سنبھال
ہاتھ یوں بھی تو نہ پھیلے کہ بنے دست سوال

میر کا شعر ہے:

آگے کسو کے کیا کرے دست طمع دراز
جو ہاتھ سو گیا ہو سرہانے دھرے دھرے

اسرار ناروی کو اپنے بعد کی نسل سے شکوہ ہے کہ اگر تم اور کچھ نہیں کر سکتے تو صوفیوں کی قناعت کو ہی اپنی زندگی کا تکیہ بنا لو لیکن میرؔ نے خود اپنی خودداریٔ ذات کے حوالے سے ہاتھ کے سو جانے کی جو کیفیت بیان کی ہے۔ وہ میرؔ کا ہی حصہ ہے۔ چونکہ اسرار ناروی ابن صفی کے ہمزاد ہیں۔ چنانچہ وہ داستانوی کرداروں کو اپنی غزلوں کا کردار بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

دولت غم اپنے ہی اوپر ہم نے خوب لٹائی
سارے جہاں میں کوئی نہ ہوگا ہم سا حاتم طائی

دریا کی گہرائی ناپو موتی ہاتھ لگیں گے
کیا پاؤ گے ناپ کے یارو جذبے کی گہرائی

دنیا کا دستور ہے کہ لوگ اپنے غموں کو بانٹ کر اپنے دل کو ہلکا کرتے ہیں لیکن اسرار ناروی اپنے غم میں کسی کو شریک کر کے کسی بھی طرح سے اس پر کھلنا پسند نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی شاعری نہ سہی لیکن اس بات کا جواز ضرور پیش کرتی ہے کہ ایک اچھا ناولسٹ ایک اچھا شاعر بھی ہے۔

اسرار ناروی کی خوبی یہ ہے کہ وہ غزل کی لفظیات کا پورا لحاظ کرتے ہیں۔ فن کی جمالیات کے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ دیکھئے 'آں جہانی' اور 'ماتم' جیسے لفظوں کا یہ حسین صرف:

چپ رہو کب تک یہ ماتم آخرش
دل ہوا ہے آں جہانی چپ رہو

ایک اور شعر دیکھئے:

میخانے سے دار تلک اپنی ہی کہانی بکھری تھی
رند بنے سرمستی میں، کچھ اور بڑھے منصور ہوئے

سرمستی صرف شراب کی نہیں بلکہ فکر و خیال کی بھی ہوتی ہے۔ جب انسان اپنی فکر میں اس قدر سرشار ہو جائے کہ اسے اور کچھ نظر نہ آئے تو وہ منصور ہو جاتا ہے لیکن تب اس کا معاشرہ اس کی آزادیٔ اظہار پر یہ کہہ کر قدغن لگا دیتا ہے کہ یہ شخص کفر بک رہا ہے۔ بس یہی بادشاہت سے جمہوریت تک یعنی میخانے سے دار تک کا قصہ ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کی طرح اسرار ناروی کی غزلوں میں بھی وہی قصہ ہے اور وہی قصہ گو۔ دیکھئے یہ شعر:

کہانی ختم ہوتی ہے نہ شب ہی
وہی معجز بیاں ہے اور ہم ہیں

یہ معجز بیاں کوئی قصہ گو نہیں بلکہ وقت ہے۔ اس کے قصے بھی سب وہی ہیں۔ یہی وقت کبھی اچھا ہوتا ہے اور کبھی برا۔ جس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور قصہ سے قصہ نکلتا رہتا ہے۔ یہ قصہ اور یہ قصہ گو اتنے ضروری ہیں کہ ان کے بغیر رات کا کٹنا دشوار ہو جاتا ہے۔

چھیڑیئے قصۂ اغیار ہی ہم سن لیں گے
کچھ تو کہئے کہ خموشی سے گھٹن ہوتی ہے

یہاں بھی شاعر اپنی ذات کی کیفیات بیان کر رہا ہے۔ یہ کسی سے ہم کلام بھی ہو سکتی ہے اور خود کلامی بھی۔ خموشی کی گھٹن کو توڑنے کے لئے ہم غیر کا قصہ بھی سن لیں گے لیکن قصہ کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ اسی کیفیت کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

چاند کا حسن بھی زمیں کے لئے
چاند پر چاندنی نہیں ہوتی

اگر زمین نہ ہو تو چاندنی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چاندنی تبھی چاندنی ہے جب وہ زمین پر اترے اور فیض رسانی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے جس طرح سورج کی روشنی سے چاند منور ہو جاتا ہے اسی طرح چاند کی چاندنی سے زمین فیضیاب ہو۔ اگر قدرت نے آپ کو کوئی مملکت دی ہے تو یہ مملکت اس وقت تک مملکت نہیں ہوگی جب تک رعایا اس سے مستفید نہ ہوں۔ کسی بھی حسین کا حسن اس کو اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ کسی نہ کسی آئینے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہر فرد اپنے سماجی نظام کا آئینہ ہونا چاہئے۔

حسن و عشق کے معاملات پر اسرار ناروی نے متعدد لطیف اشعار کہے ہیں۔ جن کی گھلاوٹ اور لگاوٹ دیکھتے ہی بنتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن بنا جب بہتی گنگا
عشق ہوا کاغذ کی ناؤ

عشق عرفان کی ابتدا ہے
حسن منزل نہیں راستہ ہے

کیا غم، شب غم کی تیرگی کیا
دل بجھ کے چراغ ہو گیا ہے

اس بت کی رگ جاں کے قریں بھی تو وہی ہے
واعظ کی سمجھ میں جو یہ آجائے تو کیا ہو

یہ شاہراہ محبت ہے آگہی کیسی
بجھا سکو تو بجھا دو شعور کی قندیل

انہیں لطیف اشاروں میں کنایوں کی زبان سے اسرار ناروی کبھی کبھی بڑے بڑے فلسفے بیان کر جاتے ہیں۔ان کی ایک غزل کا مطلع دیکھئے:

بہار گریۂ شبنم کا راز کیا جانے
یہ اس سے پوچھ کہ دیکھے ہوں جس نے ویرانے

خزاں کے دنوں میں شبنم کی ایک ایک بوند پھولوں کے پودوں کو سیراب کرتی ہے تب کہیں جا کے گلشن میں شادابی آتی ہے لیکن جو لوگ بھری بہار میں آتے ہیں وہ پت جھڑ کے دنوں میں قربانیاں دینے والوں کو کیا جانیں؟ اسرار ناروی کی غزلیہ شاعری انہیں شکووں سے عبارت ہے:

لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں
لکھی نہ جا سکی مگر اپنی ہی داستاں

دراصل ابن صفی نے اپنے ناولوں میں جو کچھ بیان کیا وہ بہت کچھ تھا لیکن ان کا غم ذات نہیں تھا۔ شاید اسی لئے کو دان کے سنجیدہ قاری یا نقاد کو ہی نہیں بلکہ خود انہیں بھی بار بار یہ کسک ہوتی ہے۔خود اسرار ناروی کے بقول:

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرارؔ
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

اس کسک کا اظہار خود ابن صفی نے ان لفظوں میں کیا ہے:

'اس سال کے مشاعرے میں میری نظم 'بانسری کی آواز' اس حد تک پسند کی گئی کہ میرے ایک استاد مسٹر ہگنس نے جو مجھے انگریزی پڑھاتے تھے اور اردو شاعری سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے، دوسرے دن کلاس میں کہا: 'فراق صاحب کی رباعیات اور بانسری کی آواز کے علاوہ مجھے تو اور سب کچھ شاعری کی بازگشت معلوم ہو رہا تھا۔ صدر شعبۂ اردو مولانا انوار الحق صاحب نے فرمایا کہ میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ایک دن آپ کا شمار صف اول کے شعراء میں ہوگا۔ (میں مولانا موصوف سے شرمندہ ہوں۔ وہ آج بھی میرے جاسوسی ناول نویس ہونے پر خوش نہیں ہیں۔)'

(بقلم خود: ابن صفی)

دوسری طرف خود پروفیسر انوار الحق پاکستان میں ابن صفی سے اپنی ملاقات کا جو حال بیان کرتے ہیں، اس میں اس کسک کی شدت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ان کے مضمون کا ایک اقتباس دیکھئے:

'.....پہلی ملاقات کے دوران وہ مجھے کچھ سہمے سہمے نظر آئے۔ غالباً انہیں پہلے سے اس بات کی فکر لاحق تھی کہ اگر میں نے انہیں ابن صفی کی حیثیت سے کریدا تو ان کا جواب کیا ہوگا.....؟ دور حاضر میں جب کہ نوجوان بزرگوں کو اپنے لئے باعث زحمت سمجھتے ہیں، اسرار کی سہمی سہمی شخصیت نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ یہ اسرار کا حسن ظن ہے، حسن اخلاق ہے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ 'ابھی کچھ لوگ باقی ہے جہاں میں' میں نے اسرار کی پریشانی کو بھانپا، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ جب وہ اپنے رنگ میں آ گئے تو میں نے دبی زبان میں پوچھ ہی لیا کہ شاعری چھوڑ کر جاسوسی دنیا ناولوں کی طرف کیوں راغب ہو گئے؟ میرا سوال سن کر اسرار نے بڑے انکسار سے نظریں جھکا کر دبی آواز میں کہا: مولانا! بات دراصل یہ ہے کہ شاعری واہ واہ کی غذا حاصل کر کے ذہن کو تقویت تو بخش سکتی ہے لیکن پیٹ بھرنے کا ذریعہ نہیں ثابت ہو سکتی۔ ملازمت مجھے پسند نہیں۔ اسی لئے جاسوسی ناولوں کو ذریعۂ معاش بنا لیا البتہ شعر و شاعری جب فرصت ملتی ہے کرتا رہتا ہوں۔'

(اسرار احمد بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں: پروفیسر انوار الحق)

اور پھر وقت کی آنکھوں نے دیکھا کہ عمران سیریز کی جاسوسی دنیا میں حیرت انگیز اسرار کھولنے والا ابن صفی ایک دن اسرار کمر بستہ کی صورت میں عالم جذب میں ٹہل ٹہل کر یہ مصرعے گنگنا رہا تھا اور اسی عالم میں وہ ۲۶/جولائی ۱۹۸۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جانے کیسی یاد کا پتھر بیتے دنوں سے آیا تھا
شیش محل خوابوں کے سارے پل میں چکنا چور ہوئے
آس پڑوس کے لوگ بھی تم کو پہچانیں تو بات بھی ہے
جگ بیتی لکھ لکھ کے صفی جی یوں تو بہت مشہور ہوئے

واقعہ یہی ہے کہ جاسوسی ناولوں کے ذریعہ دنیا کو دنیا جہان کی سیر کرانے والے ابن صفی نے کسی کو اپنی ذات کے کرب سے آشنا نہیں ہونے دیا جب کہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ جاسوسی ادب لکھ کر میں جاسوسی ادب کا سب سے بڑا آدمی بن سکتا ہوں لیکن خود جاسوسی ادب، ادب عالیہ نہیں بن سکتا۔ میرے جاسوسی ادب میں تجسس بھی ہوگا اور تحیر بھی، مثالی قصے بھی ہوں گے اور مثالی کردار بھی لیکن میں ان کے ذریعہ اپنی واردات قلبی نہیں بیان کر سکوں گا۔ میں نے دنیا کے ظاہری معاملات کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے لیکن خارجی معاملات کا یہ بیان میرا داخلی سفر تو نہیں ہو سکتا۔ اگر میں اپنے داخلی معاملات کو اپنا مایۂ اظہار اور شاعری کو اپنا پیرایۂ اظہار بنا لیتا تو شاعر ہو کر میں ایک جاسوسی ناول نگار سے بڑا فنکار ہوتا۔ چونکہ تب شاید میرا فن اپنی ہی ذات اور اپنے ہی عہد کے اوپر تنقید کی بہترین مثال ہوتا لیکن خیر! اپنے سے بڑا ہو بھی جاتا تو کیا ہوتا! جہاں ہوں، کم سے کم وہاں تو میرے برابر کوئی نہیں ہے لیکن کیا جاسوسی ادب کی تعبیر و تفہیم نقاد کے فرائض منصبی سے خارج ہے.....؟!

□□□

ابن صفی کے ناولوں کی شعریات

(وجودی حوالے سے)

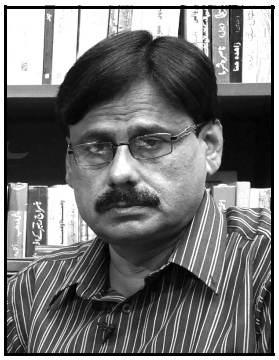

خالد جاوید

شعبۂ اردو

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

رابطہ: 9810596212

ادب کا کوئی بھی باشعور قاری ان کے ناولوں کا بغور مطالعہ کر کے کم از کم اس نتیجے پر تو یقیناً پہنچ سکتا ہے کہ ان کے یہاں واقعات کی ہیئت ناکی پر بہت کم زور ہے۔ سسپنس اور تجسس کا عنصر بھی ابن صفی کے یہاں بہت کم ہے۔ ان سب کے بجائے، ان کے یہاں انسانی صورت حال کی عکاسی زیادہ پائی جاتی ہے۔ جرم، قتل وخون، تباہ کاریاں اور سازش، ان کے یہاں انسانی زندگی سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ابن صفی ان سب کو حیات وکائنات کی جاری اور ساری کلیات میں ہی دیکھتے ہیں۔

اردو کے دوسرے جاسوسی ناول نگاروں کے یہاں اس کے برخلاف، سسپنس اور واقعہ کے بھیانک پن یا پھر محیر العقول ہونے پر زیادہ زور دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً اکرم الہ آبادی اور مسعود جاوید۔ ابن صفی نے اس قسم کا کوئی سائنس فکشن بھی نہیں لکھا جو فینٹسی کے زمرے میں آتا ہو اور زندگی کے عام معمولات سے الگ کسی Utopia کی تشکیل کرتا ہو۔

عام انسان اور انسانی زندگی سے دلچسپی نے ہی ان کے ناولوں کو ایک انفرادی حیثیت عطا کی ہے۔ ابن صفی کے بنیادی سروکار خالصتاً انسانی تھے اور جن کا رشتہ واضح طور پر وجودیت سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ انسانوں کی عام زندگی میں جو نظر نہ آنے والا ایڈونچر پایا جاتا ہے، ابن صفی اسی کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور وجودیت کے نقطۂ نظر سے زندگی کی جو ناہمواریاں ہیں یا اس میں پوشیدہ لغویت (Absured) ہے، وہ بڑے فنکارانہ مگر بظاہر سادگی کے ساتھ ابن صفی کی تحریر میں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ ابن صفی کی مقبولیت کا رمز اسی نقطے میں پوشیدہ ہے۔

ابن صفی نے اپنے لازوال کردار 'عمران' کے ذریعہ اس نام نہاد عقلیت کا جو مضحکہ اڑایا ہے وہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس سلسلہ میں آگے چل کر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ وجودی مفکرین سائنس کی میکانیکیت کے بھی اس لئے خلاف ہیں کہ سائنس بھی انسان کو نظر انداز کر دیتی ہے کیونکہ سائنس انسان کا تجزیہ اس طرح کرتی ہے جس طرح دھات اور مادے کا کرتی ہے اور انسان کو بھی ایک شئے سمجھ لیا جاتا ہے۔

اپنے ناول 'پیاسا سمندر' میں ابن صفی ایک جگہ لکھتے ہیں:

'آدمی کتنا پیاسا ہے۔تم اسے پیاسا سمندر کہہ سکتی ہو جو پانی ہی پانی رکھنے کے باوجود بھی ازل سے پیاسا ہے اور اس وقت تک پیاسا ہی رہے گا جب تک کہ اسے اپنا عرفان نہ ہو جائے۔ ابھی تو وہ چاند پر جانے کی باتیں کرتا ہے۔اس کی ذہنیت اور سوجھ بوجھ اس بچے سے زیادہ نہیں ہے جو ماں کی گود میں چاند کے لئے مچلتا ہے۔ وہ مصنوعی سیارے اڑا کر اس طرح خوش ہوتا ہے جیسے بچے صابن کے بلبلے اڑا کر مسرور ہوتے ہیں۔ چاند کا سفر آدمیت کی معراج نہیں ہے۔'

ایک ناول 'سینکڑوں ہم شکل' میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ابن مقنع کے نقلی چاند کی تلمیح بھی بیان کی گئی ہے۔اس ناول میں ایک جگہ لکھا گیا ہے:

'آدمی نے خود ہی اپنی زندگی میں زہر بھرا ہے اور اب خود ہی تریاق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے پڑوسی تک بھی اس کی پہنچ نہیں ہے۔'

اس طرح علم النفسیات میں بھی انسان کو اس کے رویوں کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے صرف عمل، ردِّعمل کا ایک مجموعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ابن صفی کے ناولوں میں نفسیاتی بصیرت کے ساتھ جگہ جگہ اس سلسلہ میں شدت پسندی کے روئے کا مذاق اڑایا گیا ہے۔خاص طور پر فرائیڈ کے نظریات کا جس سہل پسندی کے ساتھ انسانی رویوں پر اطلاق کرنے کی جو روش ایک زمانے میں عام تھی، اس پر ابن صفی نے اپنے ناولوں میں بڑے لطیف اور بلیغ طنز کئے ہیں۔ یہاں مثال دینے سے گریز کیا جارہا ہے کیونکہ ابن صفی کا قاری ان کے جملوں سے بخوبی واقف ہے اور جو ان کا قاری نہیں ہے، اس پر فرض ہے کہ اس روشنی میں ان کے ناول پڑھنے اور انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کرے۔

ابن صفی کی تحریروں کے حوالے سے، ان کی زبان اور اس کی زیریں سطح پر ایک خاص قسم کی تخلیقیت کی جو جھلک ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک بنیادی سوال یہ بھی قائم کرتی ہے کہ کیا یہ واضح طور پر جاسوسی اور مقبول عام ادب کے سروکار ہو سکتے ہیں؟

ابن صفی کی تحریریں عوام و خواص دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں مگر دراصل انہیں پسند کرنے کی وجوہات دونوں طبقوں میں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں۔ ادب کا سنجیدہ قاری انہیں، ان کی ادبی چاشنی، زبان کا تخلیقی استعمال، کردار نگاری اور ایک منفرد اسلوب اور بیانیہ ہونے کی وجہ سے پسند کرتا ہے اور جمالیاتی حظ اٹھاتا ہے جب کہ عوام محض کہانی سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے درجنوں نقال پیدا ہو گئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ ان نقالوں کی روٹی روزی کن لوگوں کے بوتے چلتی تھی یا دوسرے جاسوسی ناول نگار بھی کثیر تعداد میں کیوں شائع ہوتے رہے؟ عرض یہ ہے کہ ادب کے کسی بھی سنجیدہ اور جینوئن قاری نے ابن صفی کے کسی نقال کو نہیں پڑھا جب کہ عوام کو نہ تو ابن صفی کی تخلیقی زبان کی کوئی فہم تھی اور نہ ان کے بیانیہ اور اسلوب کی۔مقبول عام ادب کا پڑھنے والا اعلیٰ طنز یا حس مزاح اور پھکڑ پن میں کوئی فرق محسوس کرنے کا اہل نہیں ہوتا، عوام میں فریدی، حمید اور عمران فلمی ہیروز کی طرح مقبول تھے۔اس لئے اگر ان کی کوئی پھوہڑ نقل بھی پیش کر رہا تھا تو انہیں قبول کرنے میں کوئی عار نہیں تھا۔عوام کو ایک کہانی چاہئے تھی، فریدی، حمید اور عمران کی مجرموں سے لڑائی چاہئے تھی اور آخر میں مجرموں کی شکست چاہئے تھی، بالکل جیسا کہ بمبیا فلموں میں ہوتا تھا یعنی عوام ابن صفی سے نہیں بلکہ ان کے کرداروں سے تفریح حاصل کرنا چاہتی تھی اور یہ کوئی ایسی بری بات نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ادب کے تربیت یافتہ قاری اور غیر تربیت یافتہ قاری کا جمالیاتی ذوق قطعاً مختلف ہوتا ہے مگر اس امر نے ابن صفی کو اگر معاشی طور پر مضبوط اور مستحکم بنایا اور شہرت کے اعتبار سے انہیں Celeberities کے درمیان لا کھڑا کیا تو اس حوالے سے ہے جو نقصان بھی پہنچایا کہ ادبی نقادان سے بدکنے لگے اور ایک قسم کے تعصب کا شکار ہو گئے۔یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابن صفی کی عوامی شہرت سے بڑے بڑے ادب عالیہ تخلیق کرنے والے حضرات حسد کا شکار ہو کر رہ گئے۔

اپنی تمام زندگی ابن صفی اسی المیہ کا شکار رہے۔ ان کی زندگی میں ان کے فن پر کوئی بھی ایسا سنجیدہ مضمون نہیں شائع ہو سکا جو ابن صفی کے فنی امتیازات کو اجاگر کر پاتا یا ان کا حق ادا کر پاتا۔اگر اسے بڑبولا پن یا خود پسندی پر متحمل نہ سمجھا جائے تو راقم الحروف کی عرض یہ ہے کہ اس خاموش سے بہتے ہوئے دریا میں پہلی کنکری اس نے پھینکی۔

۲۰۰۶ء میں راقم الحروف کا ایک طویل مضمون 'ابن صفی چند معروضات' رسالہ اردو ادب دہلی میں شائع ہوا اور اس کے بعد ہی ابن صفی پر باقاعدہ سنجیدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ برصغیر میں کئی جگہوں پر ان کی فن اور شخصیت پر سیمینار منعقد کئے گئے۔ ادبی جرائد نے ابن صفی پر خصوصی نمبر شائع کئے۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی بھی، ابن صفی پر اتنی گفتگو ہو جانے کے بعد بھی ان کے ناولوں کا فنی اور ادبی مطالعہ سامنے نہیں آیا۔بس عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ نظر آتی ہے۔ان کی مقبولیت کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔ان کے سوانح اور ان کے اقوال وغیرہ رقم کر دئے جاتے ہیں یا پھر یہ کہ ابن صفی کے ناول قانون کا احترام کرنا سکھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ہر جاسوسی ناول قانون کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔اکرم الٰہ آبادی بھی یہی کام کرتے ہیں اور عارف مارہروی بھی۔ پھر ان میں اور ابن صفی میں کس بنا پر فرق کیا جائے اور ابن صفی کس معنی میں دوسرے ناول نگار سے برتر ہیں؟

اصل بات تو یہ ہے کہ ابن صفی کے متن کا مطالعہ خالص ادبی بنیادوں پر کرنا چاہئے۔ کسی سیاسی، سماجی

نظرئے کی روشنی میں نہیں۔ یہ کام ترقی پسند نقاد بہت کر چکے اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ خود ابن صفی بھی آخر میں اس متھ کے شکار ہو گئے تھے کہ گویا وہ صرف اور صرف عوامی ادیب ہیں۔ وہ اس امکان سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے کہ ان کی تحریروں کا مطالعہ کبھی باقاعدہ کسی سنجیدہ تنقیدی روشنی میں بھی ممکن ہو سکے گا۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ مجھے شفیق الرحمن اور بھولو پہلوان کے درمیان کھڑا رہنے دیجئے۔

آج بھی، جب ابن صفی کی تعریفوں اور ستائش اور عقیدت مندی کا ایک میلہ سا لگ گیا ہے، ان کی تحریروں کا، خالص ادبی اور فنی اعتبار سے جائزہ لینے کی کوئی کوشش (کم از کم میری نظر میں تو) نہیں کی گئی اور جب تک یہ نہیں ہوگا، تب تک مجھے یہ اندیشہ ضرور ستاتا رہے گا کہ یہ سارا شور شرابہ، کہیں ایک دن صابن کے جھاگ کی طرح نہ بیٹھ جائے کیونکہ یونیورسٹیوں میں جو ابن صفی پر مقالے لکھے جا رہے ہیں، ان کی نوعیت بھی معیاری نہیں ہے۔

در اصل ابن صفی کے ناولوں کی شعریات کا سلسلہ اردو کی مشرقی کلاسیکی روایت سے جا کر ملتا ہے۔ یوں تو ان کے یہاں مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب کی جاسوسی کہانیوں کی روایت کے سراغ بھی پائے جاتے ہیں مگر مشرقی روایت ابن صفی کی تحریروں کی سطر سطر میں اور پورے ماحول نیز اس کی جزئیات نگاری میں پیوست ہے۔ مقامیت کا عنصر اور ماحول سازی اور کردار نگاری کی سطح پر ہم اس رجحان کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں لہٰذا قدیم داستانوں اور مثنویوں کی شعریات ایک جدید اور بدلتے ہوئے تناظر میں، حیرت انگیز طور پر ان ناولوں کی بنیاد بن گئی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ میری دانست میں یہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ اس نے 'سرویٹس' کی مشہور داستان 'ڈان کیہوتے' کی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے جدید ترین مغربی ناول کا ایک ماڈل اپنے لئے تلاش کر لیا۔ وسطی امریکہ بیشتر ادیبوں مثلاً مارکیز، کارلوس فیونیٹس، حوان رلفو اور کورتازار نے بھی تقریباً یہی کام کیا اور جادوئی حقیقت نگاری کے نام پر اپنے خطے کی قدیم تہذیب اور قدیم ادبی روایت کو از سر نو زندہ کر دیا۔ اردو میں یہی کام نیر مسعود کے گنجان اور گھنے بیانیہ نے کر کے دکھا دیا۔ نیز مسعود کے بیانئے کے ڈانڈے اور بعض اوقات تھیم بھی، مشرقی کلاسیکی روایت میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ داستانوں اور مثنویوں میں رومانیت کا بھی ایک عنصر ناگزیر طور پر شامل رہا ہے۔ مغرب میں، اس لئے قدیم داستانوں کو Romances کہا جاتا رہا اور ایڈونچر کے حوالے سے 'پکارسک' بھی۔ ایڈونچر خود اپنے آپ میں ایک رومانوی شئے ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کی شعریات اس رومانویت سے بھی تشکیل پاتی ہے۔ (رائیڈر ہیگرڈ سے تو وہ بچپن میں ہی متعارف ہو گئے تھے)

ابن صفی کی شعریات اس مشرقی کلاسیکی روایت اور رومانویت سے تشکیل پاتی ہے مگر جو چیز اس روایت کو ہمارے لئے بیحد دلکش بنا دیتی ہے۔ جدید ذہن سے بآسانی ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ وہ وجودیت کی وہ زیریں سطح ہے جو ابن صفی کے ناولوں میں بڑی خاموشی کے ساتھ بغیر کسی شور شرابے اور پروپیگنڈے کے موجود ہے۔ بڑی بات یہ بھی ہے کہ یہ سب کسی تجریدی یا علامتی بیانیہ کے ذریعہ عمل میں نہیں آیا جو نام نہاد وجودیت کا ایک برانڈ بن گیا تھا بلکہ سچے، حقیقی بیانیہ پر مبنی ہے اور حقیقت نگاری کی اس روایت کی پاسداری بھی نظر آتی ہے جو ترقی پسند ادب کی دین تھی۔ وجودیت چاہے، سیاسی ہو یا مذہبی یا غیر مذہبی اور فنا پرست مگر وہ انسان کو تجرید کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی کیونکہ وجودیت جوہر پر وجود کی اصلیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اسی لئے ابن صفی کسی ازم کے قائل نہیں ہیں مگر کسی بھی ادبی متن کا معروضی تجزیہ کرنے کے لئے اس کے مصنف کے بیان اور خیال پر زیادہ بھروسہ اور اکتفا نہیں کرنا چاہئے ورنہ غالب کی تو آج کوئی اہمیت ہی نہ ہوتی۔

ابن صفی 'وجودیت' کے قائل تھے یا نہیں اسے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ان کی تحریروں پر اور کردار نگاری پر وجودیت کے رجحان کی واضح چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ ابن صفی کے نام نہاد جاسوسی ناولوں میں انسانی رواح میں خیر و شر کی کشمکش اتنے واضح انداز میں نمایاں ہوتی ہے کہ وجودیت کی تمام جمالیات ایک ساتھ روشن ہو جاتی ہے۔

ابن صفی کے ناولوں میں مجرم کردار بھی ایک قسم کی منفی وجودیت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک ابن صفی کے کرداروں کا سوال ہے تو 'عمران' کے کردار کو باقاعدہ وجودی کردار مانا جا سکتا ہے۔ اسے بجا طور پر اردو کے نمائندہ کرداروں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ عمران کے کردار میں پرتیں ہی پرتیں ہیں۔ ایسی ہی کسی پرت میں ایک بامعنی افسردگی بھی موجود ہے، وہ ایک وجودی کردار ہے۔ عمران حماقت کے فلسفے کا قائل ہے یعنی وہ تعقل پسند فلسفوں کی نفی کرتا ہے۔ ہالینڈ کے ایک عیسائی مفکر اراسمز (Erasmus) نے پندرہویں صدی میں ایک طویل مقالہ تحریر کیا تھا جس کا عنوان In Praise of Folly یعنی 'حماقت کی تعریف' تھا۔ اس مقالے کا انگریزی ترجمہ پہلی بار ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا یعنی ابن صفی کے انتقال کے پانچ برس بعد۔ ظاہر ہے کہ ابن صفی نے اس کتاب کا نام بھی نہ سنا ہوگا مگر اراسمز کے خیالات اور عمران کے کردار میں خاص مشابہت ہے۔ اراسمز بھی 'حماقت' کی تہہ میں پوشیدہ اصل عقل جو وجودیاتی تانے بانے سے تیار ہوئی ہے، کا حامی ہے۔

مگر عمران کا کردار فلسفۂ وجودیت کی منفیت کو ایک نئے اور کسی حد تک مثبت معنی فراہم کرتا ہے۔ عمران کا کردار کچھ اس تناظر کو پیش کرتا ہے کہ جیسے اسے

اپنے وجود اور کائنات کی اشیاء اور اشخاص کے درمیان اپنے رشتے کی ناہمواری اور دراڑ کا عرفان ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی دانست میں بامعنی انداز میں جینے کا ایک نیا اور انوکھا ڈھنگ اختیار کر لیا ہے جس میں غیر سنجیدگی ہی ایک اخلاقی قدر بن جاتی ہے۔ 'موت' جو فلسفۂ وجودیت میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس موت کا مقابلہ انسان غیر سنجیدہ ہو کر ہی کر سکتا ہے۔ اس لئے ابن صفی نے عمران کے ذریعہ ایک جگہ اپنے ناول 'کالی تصویر' میں کہلوایا ہے:

'آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جب کہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اسے اپنی تمام تر سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا ہے۔'

عمران ہیرو نہیں، اینٹی ہیرو ہے۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ جس اینٹی ہیرو کا وجود فلموں میں باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۷۷ء کے بعد ہی سامنے آیا، اس کا ایک ماڈل عمران کے روپ میں ابن صفی ۱۹۵۵ء میں ہی پیش کر چکے تھے۔ راقم الحروف اپنے ایک مضمون 'عمران: ایک اینٹی ہیرو' میں اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہے۔ اس سے سردست یہاں زیادہ گفتگو کی گنجائش نہیں۔ کہنے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ عمران کے کردار کی وجودی جہات کا ایک تفصیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ حمید کے کردار سے بھی وجودی جہات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ جگہ جگہ حمید کا بے سبب اداس ہو جانا، اکتاہٹ اور بیزاری کے دورے پڑنا۔ مزاح میں اپنے دکھ کو چھپائے جانا، یہ سب وجودیاتی خصوصیات ہیں۔ انور کا کردار بھی ایک بدلے ہوئے انداز کا وجودی کردار ہے جسے Rebel کہا جا سکتا ہے۔ سماج سے برہم اور نالاں اور اپنی اخلاقیات اور اپنی شرطوں پر واضح کرنے والا۔

یہاں برسبیل تذکرہ یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ 'فریدی' کا کردار ہی شاید ابن صفی کا ایک کمزور کردار ہے۔ یہ ایک سپاٹ اور غیر انسانی کردار ہے۔ ایک قسم کی Machine Reasoning یہ بہت Fendal کردار ہے اور ایک طرح سے یونانی کلاسیکی ڈراموں کا ہیرو نظر آتا ہے مگر صرف کامیڈی ڈراموں کا۔ فریدی کے کردار کو ساری بیرونی امداد حمید کے ذریعہ ہی ملتی ہے۔ حمید ہی کہانی کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ فریدی کو زیادہ تر آخر میں میک اپ کے ذریعہ سامنے آ کر صورت حال میں تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔

اگر ابن صفی نے عمران اور حمید کے کردار نہ خلق کئے ہوتے تو آج جتنی گفتگو ابن صفی پر ہو رہی ہے، شاید نہ ہو پاتی۔ راقم الحروف ایک بار پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ وہ عام سطح کے مقبول عام ادیب کبھی نہیں رہے۔ سنسنی خیزی اور چونکا دینے والا عمل ان کے یہاں بہت کم ہے۔ مقبول عام ادب میں کردار اتنے پیچیدہ نہیں ہوتے۔ ایسے ناولوں کی فضا میں کسی بھی قسم کی بصیرت کا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ بصیرت کے نام پر صرف نعرے بازی ہوتی ہے۔

بے مثال زبان جو جگہ جگہ شاعری کی سرحد کو چھونے لگتی ہے، ان کا بیحد توانا اور قوی بیانیہ، اعلیٰ کردار نگاری، اردو کا محاورہ اور چٹخارہ اور مشرقی کلاسیکی روایت کی پاسداری، رومانویت کی ہلکی سی چھاپ لئے ہوئی ایک خاموش وجودیت۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے مل کر ابن صفی کے ناولوں کی شعریات تشکیل پاتی ہے۔ کوئی بھی مقبول عام ادیب چاہے وہ جاسوسی کہانیاں لکھتا ہو یا رومانی اور سماجی، ان عناصر اور شعریات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ بعض نام نہاد ادب عالیہ تخلیق کرنے والوں کو بھی ابن صفی کی تحریروں سے تربیت حاصل کرنی چاہئے اور اس بات پر ناک بھوں سکوڑنا بند کر دینا چاہئے کہ ابن صفی عام میں کیوں مقبول ہیں۔

ابن صفی کے متن کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ، فنی ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے تاکہ ان کی تحریروں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں، ایماندارانہ اور معروضی انداز میں سامنے آ سکیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی یہ قرض ادا نہیں ہو سکا ہے۔

اتنے شور شرابے اور جلسہ جلوس کے باوجود آج بھی، ابن صفی شفیق الرحمن اور بھولو پہلوان کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔

□□□

> قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، انوری، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کر دیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور اس کے بعد منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دور حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امروہہ، الہ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تئیں نئی نسل کا رجحان کمیاب ہے۔ ادارہ 'نیا دور' بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔
>
> **(ایڈیٹر)**

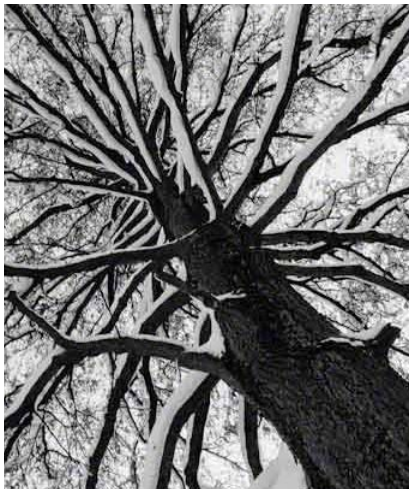

ابن صفی: جاسوسی ادب کا روشن ستارہ

محمد زاہد

B-5
پرنس دلاور جاہ لین،
گارڈن ریچ، کولکاتا
رابطہ: 8697194075

اردو میں سری یا جاسوسی ادب کو کبھی بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ لوگوں نے اسے وقت گزاری اور تفریح کا ذریعہ تو بنایا لیکن سنجیدگی سے اسے اہمیت نہیں دی۔ ادب کے ٹھیکیداروں نے جس منظم طور پر اس صنف کو اور اس کے لکھنے والوں کو ادب کے دائرے سے خارج کیا، وہ اپنی جگہ افسوس ناک ہے۔ اردو میں جن لوگوں نے جاسوسی ادب کو پروان چڑھایا ان میں منشی تیرتھ رام فیروز پوری، ظفر عمر، اظہار اثر، عارف مارہروی، اکرم الہ آبادی، سراج انور، سلامت علی مہدی، کرنل نجیت، ابن صفی، ہمایوں اقبال، مظہر کلیم، ایم اے راحت، ایس فضیلت، ظفر پیامی، مظہر الحق علوی، ایم جے عالم اور نجمہ صفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مقبولیت ابن صفی کو ملی جن کی کتابیں آج بھی ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگ ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اگر چہ ابن صفی کے انتقال کو تقریباً ۳۸ سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ان کی کہانیاں آج بھی پہلے ہی کی طرح تر و تازہ اور شاداب ہیں۔

ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ڈی اے وی ہائی اسکول سے میٹرک اور ۱۹۴۷ء میں ایوننگ کرسچین کالج، الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ بعد میں انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ابن صفی نے لکھنے کا آغاز رومانی کہانیوں سے کیا۔ ان کی پہلی کہانی 'ناکام آرزو' ہفت روزہ 'شاہد' ممبئی میں اس وقت چھپی جب وہ ساتویں درجہ کے طالب علم تھے۔

ابن صفی سے پہلے اردو میں جاسوسی ناول بہت کم تھے۔ کچھ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم تھے اور کچھ ظفر عمر کے جنہوں نے غیر ملکی تخلیقات کو اردو میں رنگ چڑھا کر پیش کیا تھا۔ ابن صفی نے پہلی بار باقاعدہ طور پر جاسوسی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے فریدی حمید سیریز کے ۱۲۶ ناول، عمران سیریز کے ۱۱۶، ایرج اور عقرب سیریز کے تین اور انور، رشیدہ سیریز کے ۴ ناول لکھے۔ ان کا آخری ناول 'آخری آدمی' تھا۔ ان میں سے صرف آٹھ ناول ایسے ہیں جن میں سے بعض کے پلاٹ اور بعض کے کردار انگریزی ناولوں سے لئے گئے ہیں جس کا اعتراف خود ابن صفی نے کیا تھا۔

دوسری اصناف کی طرح جاسوسی ادب بھی ایک مشکل فن ہے۔ اس صنف میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لئے سخت ریاضت ضروری ہے۔ پلاٹ اور واقعات کی تہہ داری، کردار نگاری، منظر کشی، مکالمہ نگاری اور

اسلوب کے ساتھ ساتھ تجسس کو برقرار رکھنا اس صنف کے لازمی عناصر ہیں۔ جاسوسی ناول میں قاری کے ذہن کو گرفت میں لینا سب سے بڑی بات ہے تاکہ اسے پورا ناول ختم کئے بغیر چین نہ ملے۔ ابن صفی اس معاملے میں دوسرے لکھنے والوں سے بہت زیادہ کامیاب رہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس کی کیا وجہ تھی۔

جاسوسی کہانیوں میں پلاٹ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر پلاٹ اچھا ہے، واقعات میں تہہ داری اور تجسس ہے تو وہ پڑھنے والے کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ابن صفی نے اپنے بیشتر ناولوں کے پلاٹ کے انتخاب میں ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے سپر پاور، تھرڈ ورلڈ، ہمسایہ ملکوں کی رقابت اور ملک میں رہنے والے دو چہرہ لوگوں کے کرتوتوں کو اپنے ناولوں کا پلاٹ بنایا جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے اور جن کی حرکتوں سے ہم میڈیا کے ذریعہ واقف ہوتے رہتے ہیں۔ فرضی اور نقلی پلاٹوں کی جگہ زندگی کی حقیقتوں سے لئے گئے یہ پلاٹ ابن صفی کے ناولوں کے لئے بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ عموماً کئی رخے ہوتے ہیں اور ہر رخ ایک الگ جاذبیت رکھتا ہے۔

پلاٹ واقعات کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ان واقعات میں دلچسپی ہے تو قاری مطالعہ جاری رہتا ہے ورنہ ناول بند کر دیتا ہے۔ ابن صفی کو واقعہ کی تہہ داری سے واقعہ برآمد کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ ان کی کہانیوں میں معمولی حادثوں سے جو واقعات جنم لیتے ہیں، قاری ان میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے ناول 'خونخوار لڑکیاں' کا اقتباس دیکھیں:

'مجمع میں اسے وہی دونوں لڑکیاں نظر آئیں مگر عجیب حال میں، وہ پاگلوں کی طرح اچھل اچھل کر ہاتھ میں آئی ہوئی چیزیں کلاک ٹاور کی طرف پھینک رہی تھیں۔ اپنے سینڈل، فاؤنٹین پین، سڑک پر پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے۔ ان کی زبان سے گالیوں کے طوفان امنڈ رہے تھے۔'

یہ عجیب واقعہ پوری کہانی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے اور کون ہے جو ان سطروں کو پڑھنے کے بعد مزید صفحات نہ الٹے؟

جاسوسی کہانیوں میں واقعات کی منظر کشی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی بنا پر کہانیوں کا رنگ دھیما اور تیز ہوتا ہے۔ اگر کوئی عجیب واقعہ یا حادثہ ہو رہا ہو اور اس کی صحیح طور سے منظر کشی نہ کی جائے تو اس کا مزا رہ جاتا ہے اور پورا منظر دھندلا جاتا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں میں واقعات کی عکاسی عموماً قدرتی، حقیقت سے قریب تر اور شفاف ہوتی ہے۔ ٹپ ٹاپ نائٹ کلب کی بات ہو یا اندھیرے میں ڈوبی عمارت میں کسی سائے کے داخل ہونے کا منظر یا مجرموں کے ہیڈ کوارٹر کا سین، ہر جگہ ابن صفی کی عکاسی متوازن رہتی ہے۔ نیم خوابیدہ مناظر کو لفظوں میں پیش کرنے میں ابن صفی کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ یہ مناظر قاری کے ذہن سے چپک کر چلتے اور سرسراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ان کے قلم کی ہر جنبش کے ساتھ پڑھنے والے کے دل کی دھڑکنیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ ان کا ناول 'چاندنی کا دھواں' اس کی بہترین مثال ہے۔

اردو کے دوسرے جاسوسی ناول نگاروں سے ابن صفی کے آگے رہنے کی وجہ ان کی منفرد کردار نگاری ہے۔ انہوں نے اتنے خوبصورت اور حقیقی کرداروں کی تخلیق کی جن سے پڑھنے والوں نے بہت زیادہ انسیت محسوس کی۔ ان کے کرداروں میں زندگی کی حرارت سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کرنل فریدی، کیپٹن حمید، قاسم، ایکس ٹو، عمران، جولیا، انور، رشیدہ، سلیمان، جوزف، صفدر وغیرہ جیسے کردار تخلیق کر کے انہوں نے اپنی اہمیت منوالی۔ اگر ایک طرف کرنل فریدی کی سنجیدگی ہے تو دوسری طرف حمید کی شوخ شرارتیں اور کہیں کہیں قاسم کی مضحکہ خیز حرکتیں۔ انہیں کہانیوں میں ایکس ٹو کی پراسرار شخصیت، علی عمران کی بظاہر احمقانہ نظر آنے والی ادائیں، عمران کے لئے جان دینے والی جولیا کی چھپی ہوئی محبت، جوزف کی اپنے باس کے لئے جان نثاری، صفدر کی مستعدی اور تنویر کی علی عمران سے جلن کا جذبہ بھی ہے۔ منفی کرداروں میں طرح طرح کے لوگ نظر آئیں گے۔ سنگ ہی دشمن ہوتے ہوئے بھی علی عمران کو بعض نازک موقعوں پر

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

سہارا دیتا ہے اور تھریسیا موقع ملنے کے باوجود علی عمران کو ختم کرنے سے گریز کرتی ہے کیونکہ وہ ایک بین الاقوامی مافیہ کی سربراہ ہونے کے باوجود اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہے۔

ابن صفی کو جس چیز نے مزید ممتاز کیا، وہ ان کا دلکش اسلوب نگارش ہے۔ ان کا اسلوب سلیس، دلچسپ، دل نشین اور نکھرا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، خوبصورت استعارے، محاوروں کا صحیح استعمال اور صاف ستھری زبان ان کی پہچان ہے۔ طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی پرت اسے بامزہ بنا دیتی ہے۔ وہ حتیٰ الامکان گنجلک الفاظ اور محاورات سے دامن بچاتے ہیں اور عام بول چال والی زبان لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جانچ شاعرانہ نزاکت اور تمثیل در آتی ہیں جو ان کے مزاج کی دین ہے۔ ان کی جاسوسی کہانیوں سے ذہن کو شاعری کا لطف اور سرور حاصل ہوتا ہے۔

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ جاسوسی کہانیوں میں سنجیدہ مسئلوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور بہت سے ناول نگاروں کے یہاں واقعی اس کا فقدان ہے مگر ابن صفی نے اپنی تحریروں میں جا بجا ان مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ اپنے ناولوں میں انہوں نے فاشلزم اور وطنی عصبیت، معاشرتی مسائل اور نسل در نسل بگڑتے ہوئے اخلاق پر نشتر زنی کی ہے۔ ان کے ناول 'سرخ دائرہ' کے یہ جملے دیکھیں:

'بڑی عجیب بات تھی۔ مردہ 'جا کی' کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ نہ گریش کو نہ تماشائیوں کو۔ گریش

ابن صفی کو جس چیز نے مزید ممتاز کیا، وہ ان کا دلکش اسلوب نگارش ہے۔ ان کا اسلوب سلیس، دلچسپ، دل نشین اور نکھرا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، خوبصورت استعارے، محاوروں کا صحیح استعمال اور صاف ستھری زبان ان کی پہچان ہے۔ طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی پرت اسے بامزہ بنا دیتی ہے۔ وہ حتیٰ الامکان گنجلک الفاظ اور محاورات سے دامن بچاتے ہیں اور عام بول چال والی زبان لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جانچ شاعرانہ نزاکت اور تمثیل در آتی ہیں جو ان کے مزاج کی دین ہے۔ ان کی جاسوسی کہانیوں سے ذہن کو شاعری کا لطف اور سرور حاصل ہوتا ہے۔

گھوڑے کی لاش پر ماتم کر رہا تھا اور تماشائی اپنی لگائی ہوئی رقم ضائع ہونے پر آہیں بھر رہے تھے۔ ایک آدمی بھی مر گیا تھا مگر وہ آدمی نہیں تھا۔ وہ تو صرف جا کی تھا۔ جا کی بہت ملتے ہیں مگر ٹمپسٹ جیسے گھوڑے نایاب ہیں۔'

ایک دوسرے ناول کا اقتباس دیکھیں:

'اگر میں اس سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو تم مجھے دیوانہ کہو گے جب کہ لاشوں پر ناچنے والوے سورما کہلاتے ہیں۔'

ایک نظر 'گارڈ کا اغوا' کے اس جملے پر:

'جس معاشرے کے افراد مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں وہیں جرائم کی گرم بازاری بھی ہوتی ہے۔'

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی کے بیشتر ناولوں میں اس طرح کے جملے بھرے پڑے ہیں:

ابن صفی کا انتقال ۲۲ر جولائی ۱۹۸۰ء کو ہوا۔ ان کے بعد اردو میں جاسوسی ادب رو بہ زوال ہو گیا۔ بعد کے لکھنے والوں میں وہ دلچسپ اسلوب نگارش اور منفرد کردار نگاری نہیں رہی۔ ابن صفی کے انداز کی جن لوگوں نے پیروی کی۔ ان میں ہمایوں اقبال، مظہر کلیم، مشتاق احمد قریشی، ایم اے راحت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں مگر یہ لوگ اس طرز کو پوری طرح نبھا نہ سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود جاسوسی ادب کے شائقین ابن صفی کو نہیں بھلا سکتے ہیں۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ر روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ر روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ر روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

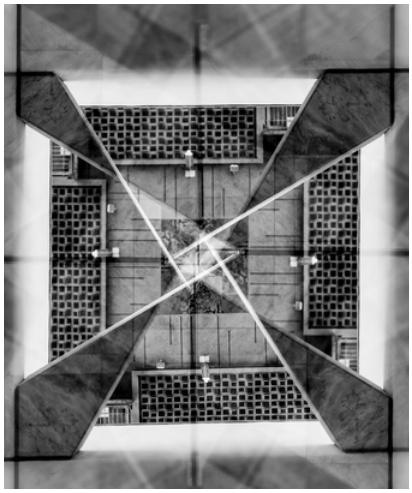

ابن صفی: اردو کا طبع زاد جاسوسی ناول نگار

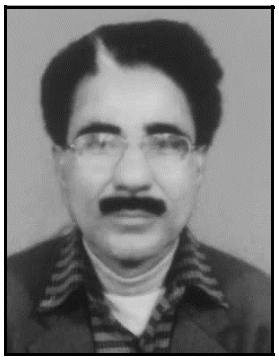

شبیر عباسی

۵۲، خلیل غربی

شاہجہانپور

رابطہ: 7499735605

میرے ایک چچا ناگپور میں رہتے تھے۔ نام تھا ان کا اشفاق احمد۔ ان کی ایک چھوٹی بہن شاہجہانپور میں رہتی تھیں۔ اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب تو خیر سے پوتے، پوتی والی ہیں۔ چچا جب بھی شاہجہانپور آتے تھے، اپنے ساتھ جاسوسی دنیا اور نکہت پبلی کیشنز کے دو چار ناول ضرور لاتے تھے۔ ان کی بہن جاسوس ناول پڑھنے کی بڑی شائق تھیں۔ جب چچا ناگپور واپس چلے جاتے تھے تو وہ مجھ سے ناول منگوا کر پڑھتی تھیں۔ چچا سے میں نے معلوم کرلیا تھا کہ یہ ناول ملتے کہاں ہیں؟ اس لئے ریلوے بک اسٹال کے چکر لگانا معمول بن گیا تھا۔

اس وقت میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ چچا کی بہن جو میری پھوپھی لگتی تھیں۔ میری ہم عمر تھیں۔ کم عمری میں رشتوں کی زیادہ سمجھ نہیں تھی۔ بس وہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ انہیں کی للک میں مجھے بھی جاسوسی ناولوں کا چسکا لگ گیا۔

ناول پڑھتے پڑھتے اس کے خالق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ ان ناولوں کے خالق ابن صفی ہیں جو کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ مسودہ عباس حسینی کو الٰہ آباد بھیجتے ہیں اور عباس حسینی اسے اپنے ادارے سے شائع کرتے ہیں۔

یہ مارچ ۱۹۲۸ء میں قصبہ نارضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام اسرار احمد تھا۔ پہلی کہانی 'ناکام آرزو' کے عنوان سے لکھی جو عادل رشید کے ہفت روزہ 'شاہد' میں شائع ہوئی۔ کرسچین کالج جو شہر کا واحد مخلوط تعلیم کالج تھا، اسکی رنگین فضاؤں میں شاعری شروع کی اور انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ شاعر بن گئے۔ سکینڈ ایر میں انہیں بزم ادب کا صدر منتخب کرلیا گیا لہٰذا سالانہ مشاعرے میں کھل کر سامنے آئے اور ایک نظم 'بانسری کی آواز' پڑھی جو بیحد پسند کی گئی لیکن ابھی تک مشاعروں اور نشستوں سے گریز کرتے رہے۔

اسی دوران عباس حسینی نے ماہنامہ 'نکہت' جاری کیا جس میں نظم کی ادارت ابن صفی اور نثر کی ادارت ابن سعید کو سونپی گئی۔ یہ ابن سعید کوئی اور نہیں 'مجاور حسین' ہی تھے جنہوں نے رومانی دنیا میں بہت ہی خوبصورت اور یادگار ناول لکھے۔

اسرار احمد ابھی تک ابن صفی نہیں بنے تھے۔ اب وہ بحیثیت شاعر مشاعروں اور نشستوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ ابن صفی کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ یہ حضرت نور ناوری کے نواسے تھے جن کا شمارہ اساتذہ میں ہوتا ہے۔

ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا، 'اردو میں جنسی افسانوں کی مارکیٹ ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا' اسی روز ابن صفی نے طے کیا کہ جنسی لٹریچر کے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی جائے۔ ان دنوں کے افسانوں میں 'افسانویت' کے علاوہ اور سب کچھ ہوتا تھا یعنی ناول میں 'ناولٹی' مفقود ہوتی تھی۔ ابن صفی نے اسی ناولٹی پر زور دیتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔

ابن صفی کے مشورے پر ادارہ 'نکہت' نے جنوری ۱۹۵۲ء میں جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا اور اس سلسلہ کا نام جاسوسی دنیا رکھا۔ اپنے انتقال تک اس سلسلہ میں تقریباً تین سو ناول لکھے جن میں صرف آٹھ انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ باقی سب کے سب طبعزاد ہیں۔ الٰہ آباد میں صرف سات ناول لکھے جس میں پہلا ناول 'دلیر مجرم' تھا۔ اگست ۱۹۵۲ء میں کراچی ہجرت کر گئے اور بقیہ ناول یہیں لکھے۔ ۱۹۵۶ء میں کراچی سے 'عمران سیریز' کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ دونوں سلسلے بیحد مقبول ہوئے۔ قارئین ایک ناول کے بعد دوسرے کا بے چینی سے انتظار کرنا شروع کر دیتے تھے اور پڑھے ہوئے ناول کو بار بار پڑھتے تھے۔

اکثر لوگ ان سے کہتے تھے:

'تم نے 'طغرل فرغان' اور اسرار ناروی کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ اگر انہیں زندہ رکھا ہوتا تو ادب عالیہ میں تمہارا بھی کوئی مقام ہوتا'

اس کے جواب میں وہ کہتے تھے:

'ادب عالیہ کی شمع جلائے پانچ، دس آدمیوں کے حلقے میں بیٹھا نظر آتا، میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، کیا یہ کسی ادبی شہ پاروں سے کم ہے۔ میری کتابیں الماری کی زینت نہ بنتی ہوں لیکن تکیوں سے نیچے ضرور ملتی ہیں'

یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی نے جو میڈیم اختیار کیا اس کے ذریعہ ان کے افکار و خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ وہ ہر طبقے میں یکساں طور پر پڑھے جاتے تھے اور یکساں طور پر ہر طبقے میں مقبول و معروف تھے۔

ابن صفی کا مطالعہ ہی نہیں، مشاہدہ بھی بہت وسیع تھا۔ جو شخص ساتویں جماعت میں طلسم ہوشربا کی ساتویں جلد کئی کئی بار چاٹ گیا ہو، اس کے مطالعہ کی وسعت کا کیا کہنا۔ شاعری، ادب، تاریخ، نفسیاب، جنسیات اور سائنس، ان سارے افق کے وہ شناور تھے۔ ان کی علمیت ان کے ہر فقرے میں جھلکتی تھی۔ ان کے تراشے ہوئے جملوں میں شگفتگی تازگی اور ادبی چاشنی کی رنگ آمیزی ملتی ہے۔

کردار نگاری میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے کردار تخلیق کئے جو آج تک قارئین کے ذہنوں میں چپکے ہوئے ہیں۔ ایسے کردار جو ہماری دنیا کے چلتے پھرتے انسان نظر آتے ہیں اور ان سے مختلف بھی۔ کرنل فریدی، کیپٹن حمید، علی عمران، انور، رشیدہ، قاسم، ایکس ٹو، صفدر سعید، جولیا نافٹر واٹر، روشی، جوزف، رحمان صاحب اور سر سلطان وغیرہ ایسے زندہ جاوید کردار ہیں جو رہتی دنیا تک پڑھے جاتے رہیں گے۔

کچھ یہی بات ان کے تخلیق کردہ مجرموں کے ساتھ بھی ہے۔ قاری پس و پیش میں پڑ جاتا ہے کہ ان سے نفرت کرے یا ہمدردی۔ ڈاکٹر ڈریڈ، قینچ، ڈاکٹر سلمان، سنگ ہی، بوغا، نانوتہ، الفانسے، تھریسیا بمل بی آف بوہمیا، لیونارڈ، لوزاٹا، علامہ دہشت ناک وغیرہ جیسے نفسیاتی کردار تخلیق کئے جو کسی زبان و ادب میں نہیں ملتے۔

ابن صفی اچھی طرح جانتے تھے کہ انسان پیدائشی مجرم یا قاتل نہیں ہوتا۔ یہ حالات ہی ہیں جو اسے مجرم بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان سب پر ان کا قلم نہایت سفاکی سے نشتر زنی کرتا تھا۔ یہی نہیں وہ انسان کی نفسیاتی الجھنوں، جنسی ناآسودگیوں اور محرومیوں پر کاری ضربیں لگانے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔

انہوں نے جہاں انفرادی مجرموں پر بے شمار ناول لکھے وہیں بین الاقوامی طور پر کی جانے والی سازشوں کو بھی بے نقاب کیا۔ جہاں ترقی پذیر ملکوں کی سیاسی مشینری بے دست و پا ہو کر رہ جاتی تھی، مثلاً ایک غیر ملکی سفارت کار کا سر سلطان سے یہ کہنا کہ 'ہماری بات مان لو، ورنہ یقین جانو، تم بے بس ہو کر رہ جاؤ گے، تمہارے وزراء تک کچھ نہیں کر سکیں گے' کافی غور و خوض چاہتا ہے۔

تلاش گمشدہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو آج کے سیاسی حالات پر صادق آتا ہے۔ رحمان صاحب سر سلطان سے کہتے ہیں:

'ساری دنیا کا کام امداد باہمی کے اصولوں پر چل رہا ہے، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ امداد دینے والے ممالک ہمیں اپنا غلام سمجھیں'

ابن صفی میں مزاح کی حس بھی تھی اور اس کے نمونے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً گاڑی میں بیٹھتے ہوئے فریدی حمید سے کہتا ہے:

'ٹپ ٹاپ کلب ہوتے ہوئے چلنا۔ بہت دنوں سے وہاں کی رس ملائی نہیں کھائی۔ حمید جھلایا ہوا ہے۔ خاموش رہتا ہے۔ فریدی اس کو چھیڑتے ہوئے کہتا ہے، ہو سکتا ہے رس ملائی پر آپ کو کوئی خاتون یاد آ رہی ہوں۔ حمید جھنجھلا کر جواب دیتا ہے، جی نہیں! میری نفسیات میں پیچیدگی نہیں ہے'

عمران سیریز کے ایک ناول کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'ڈاکٹر دعا گو کی سکریٹری بہت شوخ رنگ کی لپ اسٹک استعمال کرتی تھی۔ عمران جھپٹ کر اس کے قریب جاتا ہے اور جھینپے ہوئے انداز میں ٹھٹھک جاتا ہے۔ وہ پوچھتی ہے تو عمران شرما کر کہتا ہے، میں سمجھا، بلبل الٹ گیا ہے۔'

ڈیڑھ متوالے میں عمران حالات حاضرہ کے لباس پر طنز کرتا ہوا نظر آتا ہے:

'نینا کی ٹائٹ جینس دیکھتے ہوئے عمران شیخ ثناء اللہ شارٹی سے کہتا ہے: یار، اس کی جینس تو تھوڑی ڈھیلی کروا دو، ایسا معلوم ہوتا ہے، دو تربوز آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے جا رہے ہوں۔'

تلاش گمشدہ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

عمران، جیمسن کے ہلدا کے بارے میں رپورٹ طلب کرتا ہے۔ وہ وہی دہرانے لگا جو عمران صفدر سے تین مرتبہ سن چکا تھا۔ البتہ اضافہ صرف اس قدر تھا کہ ان میں ہلدا کے حسن کی تعریف بھی شامل ہو گئی تھی اور جیمسن کو اس کی یہ ادا بہت بھلی لگی تھی کہ وہ ہر بات کے اختتام پر اپنے ہونٹ بند کر کے ایک خاص انداز میں ہلکی سی جنبش دیتی تھی۔

تمہیں اس جنبش پر کیا محسوس ہوتا تھا۔ عمران نے بیحد سنجیدگی سے پوچھا۔

بس یہ محسوس ہوتا تھا یور مجسٹی! جیسے دل پہلو سے نکل جائے گا۔

لہٰذا میں اگر اس پہلو کی ہڈیاں توڑ دوں تو اسے نکل جانے میں آسانی ہو جائے گی۔'

'موروثی ہوس' کا اقتباس دیکھیں:

'بجلی کے کڑاکے پر قاسم کا جسم تھلتھلا کر رہ جاتا ہے۔ شاہدہ اس کی تھلتھلاہٹ اور ڈر پر کہتی ہے، کائنات کو مسخر کرنے والا آدمی بجلی کے کڑاکے سے ڈرتا ہے۔

قاسم حمید سے پوچھتا ہے: حمید بھائی، یہ 'مسخر' کیا ہوتا ہے؟

حمید جھنجھلا کر جواب دیتا ہے: کسی بہت موٹی عورت سے شادی کرنا۔

قاسم ٹھنڈی سانس لے کر کہتا ہے: میری ایسی قسمت کہاں! میرے باپ نے تو اپنی مریل بھتیجی مسخر کرا دی تھی۔'

ابن صفی نے صرف کردار ہی تخلیق نہیں کئے بلکہ انہوں نے ملک بھی تخلیق کئے ہیں۔ یہ شاعری نہیں، واقعی انہوں نے نئے جہان تعمیر کئے ہیں مثلاً شکرالی، وادیٔ مقلاق، کراغال اور زیرولینڈ۔ حاجی عدیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

'شکرال کا ماحول، وہاں کے کردار، ان کی نفسیات، ان کی سوچ کا انداز، ان کا رہن سہن، ان کے رسم و رواج، ان کے مذاہب، ان کا فلسفۂ حیات، ان کی محبتیں اور نفرتیں، ان کی دشمنی اور دوستی، ان کی بود و باش اور ان کے جنگ کے انداز، ایک ایک چیز پر ابن صفی کے قلم نے گلکاریاں کی ہیں اور ایسے نقشے کھینچے کہ ماحول کی اجنبیت کے باوجود ہم خود کو اسی ماحول کا حصہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔'

'زیرولینڈ کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ امن و سلاتی کی دشمن بڑی طاقتوں کا ایک ایسا گروہ جن کے لئے زیرولینڈ ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔'

جاسوسی دنیا ایک کتابی رسالہ نہ تھا۔ یہ تو ایک ایسا سیلاب تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندو پاک کے فحش اور جنسی لٹریچر کو اپنی زد میں لے لیا اور خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اس دور میں رکیک، فحش اور جنسی کتابوں کی بڑی مارکیٹ تھی۔ ابن صفی اس تحریک کے خلاف جہاد کے لئے آئے تھے۔ جاسوسی دنیا کے چند ہی ناول مارکیٹ میں آئے تھے کہ ابن صفی کا نام ایک طلسم کی طرح لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جس ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کی کتاب کی اشاعت چار، پانچ سو آگے نہ پڑھتی ہو، وہاں ابن صفی کی کتابوں کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی، یہ کسی محیر العقول کارنامے سے کم نہیں تھا۔ ابن صفی ہی وہ واحد مصنف ہیں جنہوں نے عام لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا شعور عطا کیا۔

ابن صفی جب بیمار ہوئے اور ایک طویل عرصے تک ان کے ناول مارکیٹ میں نہیں آ سکے تو ان کی شہرت و مقبولیت کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنے ابن صفی پیدا ہو گئے جن میں ایچ اقبال، این صفی، ابّن صفی اور نجمہ صفی وغیرہ نے انہیں کے کرداروں کو لے کر ناول لکھنے شروع کئے۔ سلامت علی مہدی، عارف مارہروی، فاروق ارگلی، خان محبوب طرزی، اظہار اثر، شہنشاہ مرزا نے بھی طبع آزمائی کی۔ اکرم الہ آبادی نے 'جاسوسی پنجہ' نامی سلسلے میں خان، بالے سیریز کے ناول لکھے۔ ان میں سے سے کچھ نے شمع پبلی کیشنز کے 'مجرم' میں بھی قانون والا اور آفتاب ناصری کے قلمی نام سے ناول لکھے لیکن جو شہرت و مقبولیت ابن صفی کے حصے میں آئی تھی وہ کسی کا نصیب نہ بن سکی۔

صحت یاب ہونے پر ان کا شاہکار ناول ڈیڑھ متوالے منظر عام پر آیا جس کے دیباچے میں انہیں نقالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر لکھا:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ابن صفی کے جاسوسی ادب نے اس دور میں لوگوں کو کچھ پڑھنے کی ترغیب دی جو کتاب کو ہاتھ میں لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان میں عام لوگ ہی نہیں، بڑے بڑے علمداں اور دانشور بھی شامل تھے جو ابن صفی کے ناول بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اور ایک ہی نشست میں کتاب ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھتے

تھے۔ میرے ایک عزیز دوست مرحوم م۔ ع۔ غم جن کے تین افسانوی مجموعے 'جیت'، 'انداز' اور 'سوتے جاگتے ضمیر' زیورطبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئے، وہ ابن صفی کے ناولوں کو اپنے دوستوں کے درمیان پڑھ کر سنانے کے عجیب وغریب شوق میں مبتلا تھے۔

ابن صفی ایک عظیم مصنف ہی نہیں بلکہ وہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور دوسرے ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ انسانی محرومیوں اور نا آسودگی پر کڑھتے تھے جس کا اظہار جگہ جگہ ان کے ناولوں میں ملتا ہے۔

یعقوب جمیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

'ابن صفی پیدائشی ادیب تھے۔ انہوں نے اپنے جاسوسی ناولوں میں زندگی کے جتنے اہم پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے، شاید ہی کسی ادیب نے اٹھایا ہوگا۔ اردو کے ٹھیکیدار اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی کے ناول محض وقت گزاری کے لئے ہی نہیں پڑھے جاتے، ان میں کوئی بات تو ایسی ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ بات ہے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے ملکی اور سماجی مسائل کی۔ ان کی تحریروں میں کہیں انسانی زندگی کے روابط نظر آتے ہیں تو کہیں انسانی قدریں ٹوٹتی بکھرتی نظر آتی ہیں۔ کہیں ایک شخص کی شیطانی خواہشات پورے ملک کی تباہی کا سبب بنتی دکھائی دیتی ہیں تو کہیں ایک ملک اپنی برتری منوانے کے لئے اپنے پڑوسی ملک کو جہنم کی آگ میں جھونکنے پر تیار نظر آتا ہے۔'

مشہور نقاد و دانشور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ۱۷/مارچ ۲۰۰۷ء میں ابن صفی کی خدمات کے موضوع پر ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) میں ماڈرن ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے شعبۂ اردو کی سربراہ کرسٹینا اوئسر ہیلڈ کے ایک لکچر کا اہتمام کیا تھا جس میں موصوفہ نے Ibne Safi: A Best Selling Neglected Author کے عنوان سے لکچر دیا جس میں انہوں نے ابن صفی کو ایک باشعور ادیب قرار

میرانیس نمبر

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'میرانیس نمبر' بھی شامل ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۱۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملاکر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

دیا بلکہ ابن صفی کی تحریروں میں ایک مشن اور مقصد کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ان تحریروں کو محض تفریحی ادب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کرسٹینا نے ابن صفی کے متعدد ناولوں کے جرمن زبان میں ترجمے بھی کئے۔

جلسے میں موجود دوسرے دانشور اور ادیب حضرات نے ابن صفی سے اپنی گہری عقیدت اور ان کی گرانقدر خدمات کا بھی اعتراف کیا۔ صرف اشتراکی اور ترقی پسندی کی ایک لابی ہی جاسوسی ادب کو لائق اعتنا نہیں سمجھتی باقی اکثر ادیب و شاعر اور یونیورسٹیز کے پروفیسرس نے نہ صرف ابن صفی کو پڑھا ہے بلکہ ان کا زبانی اعتراف بھی کیا ہے۔ ابن صفی نے اپنی تحریروں سے پوری ایک نسل کی ذہنی آبیاری کی بلکہ اردو پڑھنے کی طرف عام قارئین کو راغب کیا۔

ابن صفی کی ایک اور خصوصیت کا ذکر نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہے گی۔ ابن صفی ایشیا کے وہ واحد ادیب ہیں جنہوں نے کبھی کسی کی ملازمت اختیار نہیں کی۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے ذریعہ اپنی روزی، روٹی حاصل کی بلکہ اپنے بچوں کے لئے آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا کی۔ یہ بھی ایک کارنامہ ہی تھا کہ آج ہندو پاک جیسے ترقی پذیر ملکوں میں قلم کے ذریعہ روزی کمانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

اب وقت آگیا ہے کہ اس Neglected ادیب پر توجہ دے کر اس کا جائز مقام متعین کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ مدراس (چنئی) اور دہلی میں کئی ادیبوں نے اس طرف توجہ دی ہے اور ابن صفی پر کام شروع کردیا ہے۔

آخر میں اردو ادب کے ناقدین سے درخواست ہے کہ اپنی وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے دنیا کے دوسرے زباب وادب کی طرح جاسوسی ادب کو بھی ادب کی ایک شاخ کے طور پر متعارف کرائیں تاکہ اس عظیم قلمکار کی خاطر خواہ پذیرائی ہو سکے کیونکہ ابن صفی کا اردو پر اور اردو پڑھنے والوں پر احسان عظیم ہے۔

❑❑❑

پاپولر لٹریچر اور ابن صفی: ایک مطالعہ

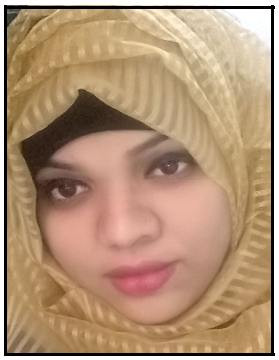

صالحہ صدیقی

157/12
راجہ پور، الٰہ آباد
رابطہ: 9899972265

اردو ادب میں تبدیلیوں کے ساتھ اس میں نئی اصناف بھی شامل ہوتی رہی ہیں۔ فکشن نے بھی داستان سے ناول اور پھر افسانہ تک کا سفر طے کیا۔ اور آج اردو ادب میں اس کا اہم مقام ہے۔ یوں تو اردو کے نثری اصناف میں داستان، ناول، ڈراما، افسانہ، مختصر افسانہ، خاکا، انشائیہ، مقالہ، صحافت، رپورتاژ، طنز و مزاح، خطوط سبھی شامل ہیں، لیکن جن لٹریچر کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ان میں داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، شامل ہیں۔ داستان، ناول، اور افسانہ دراصل ایک ہی نثری صنف کے مختلف روپ ہیں۔ ان تینوں صنفوں کو ہی ''افسانوی ادب'' یا ''فکشن'' کا نام دیا جاتا۔ ان تینوں کی بنیادی خصوصیت ایک ہے اور وہ ہے'' قصہ پن''، یعنی ہر قدم پر یہ تجسس کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اور یہ تجسس کی کیفیت ہی فکشن کی جان ہیں۔ اردو میں کئی طرح کے ناول لکھے گئے ادبی، اصلاحی، جاسوسی۔ ادبی اور اصلاحی ناول تو لکھنے کا سلسلہ ابتداء سے آج تک بدستور جاری ہیں۔

اردو ادب میں لٹریچر کی پاپولیرٹی کی بھی اپنی کہانی ہیں اگر ہم تاریخ کی ورق گردانی کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ زمانی اقدار کے مطابق لٹریچر نے اپنی صورت بدلی ہیں۔ ایک وقت تھا جب طویل داستانوں کا دور تھا جب لوگوں کے پاس فرصت تھی اور یہی ان کے وقت گزاری کا سامان بھی تھا۔ وہ ایسے قصے سننا پسند کرتا تھا جس سے عقل حیران رہ جائے۔ جنھیں ہم مافوق الفطری عناصر بھی کہتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں اس صنف پر خاص توجہ کی گئی خصوصا فورٹ ولیم کالج کے منصوبے کے تحت وجود میں آئی جن میں معروف داستانوں میں باغ و بہار (میر امن) آرائش محفل، اور طوطا کی کہانی (حیدر بخش حیدری)، داستان امیر حمزہ (خلیل علی خان اشک)، نثر بے نظیر (بہار علی حسینی) اس کے علاوہ بھی بے شمار ناول جیسے نورتن (محمد بخش مہجور) فسانہ عجائب (سرور)، گل صنوبر (نیم چند کھتری) الف لیلہ، بوستان خیال، طلسم ہوش ربا (مرزا حیرت اور رتن ناتھ سرشار)، وغیرہ ایسی داستانیں ہیں جن کا جادو عوام کے سر چڑھ کر بولا۔ جس کا طلسم اس زمانے کے ہر قاری پر ہوا بعد میں اس پر ٹی وی سیریل اور فلمیں بھی بنیں۔ یہ وہ داستانیں ہیں جن کے بغیر اردو داستان کی تاریخ نامکمل ہیں۔

یہ وہ عرصہ جب داستانوں کا ہی بول بالا تھا جب سیکڑوں داستانیں رقم کی گئی۔لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مصروفتیں بڑھی، انسانی زندگی کی ترقی اور سائنسی ایجادات واختراعات نے جب انسان کو گمراہی وغفلت سے باہر نکال کر زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا تو فطری طور پر وہ خوابوں و خیالوں کی دنیا اور مافوق الفطری عناصر پر مبنی قصوں وکہانیوں سے دور ہونے لگا اور اس کی دلچسپی ان قصّوں میں ختم ہونے لگی۔روزمرہ کی زندگی میں بڑھتی مصروفیات نے اسے طویل داستانوں سے دور کر دیا۔کیونکہ اب ان کے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ وہ ان کا مطالعہ کرسکیں۔لیکن جب ان کو وہ قصہ نظر آیا جو حقیقت پر مبنی تھا اور جو زندگی اور سماج کی حقیقتوں کا ترجمان بھی تھا اور جس کا مطالعہ داستان کے مقابلے کم وقت میں ممکن تھا،جس میں آس پاس کے ماحول کے علاوہ معاشرے کے نشیب وفراز اور تبدیلیوں کا خاکہ پیش کیا جاتا تھا،تو عوام نے اس صنف کو بخوشی قبول کرلیا اور دن بہ دن ترقی کے مراحل طے کر ہر خاص وعام میں مقبول ہوتی چلی گئی۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول اپنے دور کی تہذیبی اقدار کی کشمکش کا رزمیہ ہوتا ہے۔اور ان حقایق کی پیشکش کے لیے ناول نگار اپنے تخیل کے زریعہ ''قصہ پن'' کا رنگ گھولتا ہے اور قارئین کے لیے دلچسپ بناتا ہے۔ ناول ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ایک انسان اپنی زندگی سے متعلق تمام رنگ دیکھ سکتا تھا،اس قصے نے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا،لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کی غیر معمولی مقبولیت کا راز اس کی اسی جمہوریت پسندی میں مضمر ہے۔مولوی نذیر احمد کے نزدیک:

''جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے اس وقت سے مرنے تک اس کو جو بھی باتیں پیش آتی ہیں۔اور جس طرح اس کی حالت بدلا کرتی ہے ان سب کا بیان ہی ناول ہے۔''

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے،اس کی شکل (Novella) ہے۔جو اردو میں انگریزی کے توسط سے آئی۔ناول اردو ادب کی اہم شاخ ہے جس میں ادب کی ممتاز شخصیات نے طبع آزمائی کی ہے۔یہ ایک مشکل فن ہے جس میں کچھ فنی لوازم بھی موجود ہے جس کے بغیر بہترین ناول کی تخلیق ممکن نہیں۔ناول کے اجزائے ترکیبی میں (۱) قصہ (۲) پلاٹ (۳) کردار نگاری (۴) مکالمہ نگاری (۵) منظر نگاری (۶) نقطۂ نظر کا ہونا لازمی ہے۔جس کے بغیر ناول کا تصور ممکن نہیں۔نذیر احمد سے اردو ادب میں ناول نگاری کی بنیاد پڑی۔جس طرح انگریزی میں رچرڈسن کی تخلیق ''پامیلا'' سے ناول نگاری کا آغاز ہوا اسی طرح اردو میں نذیر احمدؔ کی ''مرأۃ العروس 1869''،''توبتہ النصوح 1877''،''بنات النعش 1873''،''ابن الوقت 1888''،اور''ایامیٰ رویائے صادقہ''جیسے ناول اردو ناول کا نقطۂ آغاز کہے جاسکتے ہیں۔نذیر احمد نے ان تمام ناولوں کو طبقۂ نسواں کے مسائل کو اور ان کی اصلاح کے لیے لکھے تھے۔اس صنف کی مقبولیت اور ابتدا ہی سے تخلیق کاروں کی اس صنف کی طرف رجحان کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہیں کہ ابتدا ہی سے ہمیں ناول نگاروں کی ایک طویل فہرست دیکھنے کو ملتی ہیں۔جن میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین قلم کار بھی پیش پیش رہیں جن کا ذکر طوالت کے سبب نہیں کیا جارہا ہے۔

داستان تو بدلتے وقت کا ساتھ نہ دے پائی لیکن ناول کی مقبولیت اور اس کی ہر دل عزیزی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہیں کہ اردو ادب میں اپنی پیدائش سے لے کر دور حاضر تک یہ اسی طرح پڑھی اور لکھی جارہی ہیں۔اور ہر دور کے سماج کا آئینہ بن کے نئے نئے روپ دھارن کررہی ہیں۔جس طرح شاعری میں غزل کی مقبولیت کبھی کم نہیں ہوئی اسی طرح اردو نثر میں ناول کی مقبولیت اپنی جگہ قائم ہیں یہ الگ بات ہے کہ لکھنے والوں کی تعداد آج اتنی نہیں جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔

ناول کے بعد جس صنف کو ہر دل عزیز صنف کا درجہ حاصل ہے وہ ہے افسانہ۔افسانہ نگاری کی بنیاد گزار پریم چند کو مانا جاتا ہیں۔1936 سے 1947 کا زمانہ مختصر افسانوں کے عروج کا دور کہا جاسکتا ہیں۔اس دور کے ممتاز افسانہ نگاروں میں پریم چند،کرشن چندر،راجندر سنگھ بیدی،سعادت حسن منٹو،سلطان حیدر جوش،سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کی رکھی ہوئی بنیاد پر آنے والے بیس،پچیس برسوں میں علی عباس حسینی،مجنوں گورکھپوری،احمد نسیم قاسمی،حسن عسکری،اور ممتاز مفتی،نیاز حمد اکبر آبادی،کوثر چاندپوری وغیرہ جیسے اہم افسانہ نگاروں نے افسانوی فن کی ایک ایسی عمارت تعمیر کہ جس میں زندگی کی حقیقتیں اور فن کی رعنائیاں دست بدست ایک دوجے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں ،پھر قرت العین حیدر،انتظار حسین ہاجرہ مسرور،اور خدیجہ مستور، کا زمانہ آیا۔اس زمانے میں افسانہ نگاروں کی تعدا د میں اضافہ کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات بھی شامل ہوئے۔ بہر حال افسانہ اپنی ابتداء سے آج تک ہر دل عزیز بنی ہوئی ہیں اور اس میں دست آزمائی کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہیں۔اردو نثر کا شاید ہی کوئی ایسا تخلیق کار ہو جس نے افسانہ نہ لکھا ہو۔افسانے میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو موضوع سخن بنایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں جاسوسی ناولوں کے ذریعہ کتابوں سے دوستی کرنے والے ابن صفی جن کا خود یہ ماننا تھا کہ کتابیں ایسی ہونی چاہیے کہ وہ الماریوں میں نہیں بلکہ تکیے کے نیچے رکھی ہو،اور ہوا بھی یہی ان کے ناول ہر عمر کے نوجوانوں نے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا۔ 1948 میں جب عباس حسینی نے ماہنامہ ''نکہت'' کا آغاز کیا،تو اس رسالے میں شعبۂ شاعری کی نگرانی کے لیے ابن صفی کو مقرر کیا گیا جبکہ شعبہ نثر

کے نگراں ابن سعید (پروفیسر مجاور حسین رضوی) تھے ۔یہی سے ابن صفی نے اصل لکھنے کی شروعات کی اور اپنی وفات 1954 تک تقریبا 250 جاسوسی ناول تصنیف کیے۔ابتدائی دور میں نقادوں نے انھیں ادیب تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا لیکن آنے والے وقت میں ان سب کو ان کی قابلیت کا اعتراف بہ بانگ دہل کرنا پڑا۔

ابن صفی اپنے میدان کے مرد کامل نظر آتے ہیں۔جنھوں نے جاسوسی ناول کو اپنے دم پر اس مقام پر لے گئے جہاں نہ ان کے پہلے کوئی نظر آتا ہے اور نہ بعد۔۔۔مختصرا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کہانی انھیں سے شروع اور انھیں پر ختم ہوتی ہے۔یہ بات اس لحاظ سے بھی انتہائی اہم ہے کہ ناولوں اور افسانوں کے خمار میں ڈوبے اس عہد کے قاریوں کو اپنے جاسوسی ناول کے سحر میں دیوانہ وار گرفتار کردینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہوسکتا،آج بھی جب ابن صفی کا ذکر چھڑتا ہے تو ہر کسی کی یادوں کی پوٹلی کھل جاتی ہے اور ان کے ناولوں کو پڑھنے اور تجسس میں کاٹے گئے اگلی قسط کے انتظار میں گزری شب و روز کی داستانوں کی نہ ختم ہونے والی کہانیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ابوالخیر کشفی اور سرشار صدیقی جیسی باذوق شخصیات بھی ابن صفی کے ناولوں کو ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے۔اردو کی مایہ ناز شخصیات نے ان کے ناولوں کے سلسلے میں اپنے اپنے نظریات پیش کیے یوں تو یہ فہرست بہت طویل ہے جن میں سے میں چند کا ذکر یہاں کرنا چاہتی ہوں تاکہ ابن صفی کے ناولوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ان شخصیات کے تاثرات اور خیالات کو بھی جانا جاسکے ۔ان میں پروفیسر مجاور حسین رضوی کے مطابق ''ابن صفی کے ناولوں میں تجسس اور پراسرار واقعات میں نصیحت کا شائبہ تک نہیں ہے نہ جانے کتنے لوگوں نے ان کے ناولوں کے ذریعہ اردو سیکھی ہے اور اردو پڑھنے کا ذوق حاصل کیا ہے''۔خالد جاوید کے مطابق ابن صفی کی تحریریں دراصل ایک مہاکاویہ اور مہابیانیہ ہیں جو لگاتار اٹھائیس برس قسط وار شایع ہوتی رہیں۔اسی طرح ایک ناقد نے کہا کہ ابن صفی مزاح نگار بھی ہوتے تب بھی اردو ادب میں ان کا ایک اعلیٰ مقام

ابن صفی کے ناول صرف وقت گزاری یا لطف اندوزی کا سامان مہیا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی آفاقیت کا ایک اہم وصف یہ بھی تھا کہ انھوں نے جاسوسی ناولوں کے پس پردہ سماج و معاشرے اور زندگی کے اہم ترین حساس پہلوؤں کے ساتھ رستے ہوئے ناسوروں کی بھی نمائندگی عمران ،کیپٹن حمید ،کرنل فریدی، سارجنٹ حمید جیسے ان گنت کرداروں کے ذریعہ کیں۔

کہنے کو تو وہ ایک جاسوسی ناول لکھ رہے تھے لیکن ان کے ناولوں میں زبان و بیان کی قدرت،فطرت کی عکاسی ،تخیل کی پرواز ،لفظوں معانی کی بنت ،انسانی نفسیات کی گرفت ،مذہبی فلاسفی،اور جدید دور کی تمام اصلاحی و انقلابی تحریکوں کی گونج ،بدلتے وقت کے بدلتے تقاضوں پر نظر،وقت کے ساتھ چلنے کی تلقین،جدید سائنسی پیش رفت قابل دید ہیں۔

ہوتا۔ہندوستان کے علاوہ بیرون ممالک کے مصنف و ادیبوں نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا انگریزی کے مشہور ناول نگار اگاتھا کرسٹی نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ میں تو اردو نہیں جانتی مگر مجھے معلوم ہے کہ وہاں صرف ایک اور یجنل مصنف ہیں ابن صفی ۔۔۔۔اسی طرح اوسلو یونیورسٹی ناروے کے پروفیسر فین تھیس کا کہنا ہے کہ ابن صفی کے ناولوں میں دو چیزیں بہت اہم ہیں ان کے ناولوں کی زبان رواں اور انھوں نے مزاح اور سسپنس کو یکجا کردیا ہے۔

اردو کے علاوہ ہندی میں ابن صفی کے ناولوں کا ترجمہ شائع ہوا کرتا تھا ۔ابن صفی کے ناولوں کی مقبولیت ہندی زبان میں بھی اردو جیسی ہی تھی البتہ ہندی میں ان کے کرداروں کے نام تبدیل کردیے گئے ۔فریدی کی جگہ ونود اور عمران کی جگہ راجیش۔جب کہ حمید اور قاسم ان کے نام ہندی میں بھی یہی لکھے گئے ہیں۔حمید ابن صفی کا ایک ایسا کردار ہے جسے پڑھ کر ''فسانۂ آزاد'' کے خوجی اور ''طلسم ہوشربا'' کے عمرو عیار کی یاد تازہ کردیتا ہے،جو ان دونوں کرداروں کی طرح ہی لافانی ہے۔ابن صفی نے اپنے پہلے ہی ناول ''دلیر مجرم'' جو 1953ء میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اردو دنیا کو اپنے لافانی کردار سارجنٹ حمید اور انسپکٹر فریدی کے کردار کو روشناس کرایا۔

اس عہد میں ابن صفی کے ناول فروخت کے اعتبار سے بھی اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں میں دیگر ناولوں کے مقابلے سب سے زیادہ تھی۔

ابن صفی کے ناول صرف وقت گزاری یا لطف اندوزی کا سامان مہیا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی آفاقیت کا ایک اہم وصف یہ بھی تھا کہ انھوں نے جاسوسی ناولوں کے پس پردہ سماج و معاشرے اور زندگی کے اہم ترین حساس پہلوؤں کے ساتھ رستے ہوئے ناسوروں کی بھی نمائندگی عمران،کیپٹن حمید،کرنل فریدی،سارجنٹ حمید جیسے ان گنت کرداروں کے ذریعہ کیں۔کہنے کو تو وہ ایک جاسوسی ناول لکھ رہے تھے لیکن ان کے ناولوں میں زبان و بیان کی قدرت،فطرت کی عکاسی،تخیل کی پرواز،لفظوں معانی کی بنت،انسانی نفسیات کی گرفت،مذہبی فلاسفی،اور جدید دور کی تمام اصلاحی و انقلابی تحریکوں کی گونج

،بدلتے وقت کے بدلتے تقاضوں پر نظر،وقت کے ساتھ چلنے کی تلقین ،جدید سائنسی پیش رفت قابل دید ہیں ۔ان کے ناولوں میں پیش کردہ ماحول میں رونما ہونے والے واقعات ،جرائم ،چاور ان کی تحقیقات میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری مایوس نہیں ہوتا وہ اندھیروں میں نہیں بھٹکتا بلکہ اس کے اندر ایک امنگ ایک ہلچل اور ایک روانگی پیدا ہوجاتی ہے ۔مختصراہم کہہ سکتے ہے کہ ان کے تمام کردار جیتے جاگتے سماج کے نمائندہ ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تھکے ہوئے ذہنوں کو صحت مند تفریح مہیا کرنے کی کوشش کی ۔ابن صفی نے اپنے ناولوں کو دو سیریز میں پیش کیا ''فریدی سیریز'' اور ''عمران سیریز'' ۔ان کرداروں کا وصف یہ ہے کہ پہلا کردار کرنل فریدی ہے جوانسان کم اور ربوٹ زیادہ نظر آتا ہے۔

مختصرا یہ کہ ابن صفی کی شہرت ومقبولیت کو دیکھ بے شمار تخلیق کاروں نے اس صنف میں دست آزمائی کی ۔بقول مشرف عالم ذوقی ''جاسوسی ناولوں سے محبت کرنے والے اس دور میں ابن صفی سے ملتے جلتے کئی ناموں کی بارش ہوچکی تھی ،مگر ابن صفی کا انداز کسی اور کو نصیب نہیں ہوا'' عالم یہ ہیں کہ

آج بھی ان کے چاہنے والوں کی طویل فہرست ہے۔اس کی اہم وجہ شاید یہ بھی ہو کہ پچاس برس قبل (۵۰) لکھے گئے ناول آج کے تناظر کا حال بیان کرتی ہیں ۔اور بڑے فنکار کا کمال ہی یہی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی تحریروں کی تازگی بنی رہے،ابن صفی کے ناول ایسے ہی ہیں۔ جو آج کی ترقی یافتہ اور ٹکنالوجی سے بھرے بازار میں اپنے قاری کو چونکنے پر مجبور کردیتی ہیں ۔جو مقبولیت جو شہرت ابن صفی کے حصے آئی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو،ان کے بعد یا ان کے پہلے آج تک کوئی ابن صفی کا ثانی پیدا نہیں ہوا ان کا مقام اپنی جگہ آج بھی قائم ہیں ۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لٹریچر کی پاپولیرٹی یا اس کی مقبولیت ہر زمانے میں اس کے اقدار کے مطابق بدلتی رہی ہیں ۔ادب سماج و معاشرے کا آئینہ ہوتا ہیں ۔جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا ،مصروفتیں بڑھی، لٹریچر کی صورت بھی بدلتی رہی ۔آج کا زمانہ موبائل،

آج بھی ان کے چاہنے والوں کی طویل فہرست ہیں ۔اس کی اہم وجہ شاید یہ بھی ہو کہ پچاس برس قبل (۵۰) لکھے گئے ناول آج کے تناظر کا حال بیان کرتی ہیں ۔اور بڑے فنکار کا کمال ہی یہی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی تحریروں کی تازگی بنی رہے،ابن صفی کے ناول ایسے ہی ہیں۔ جو آج کی ترقی یافتہ اور ٹکنالوجی سے بھرے بازار میں اپنے قاری کو چونکنے پر مجبور کردیتی ہیں ۔جو مقبولیت جو شہرت ابن صفی کے حصے آئی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو،ان کے بعد یا ان کے پہلے آج تک کوئی ابن صفی کا ثانی پیدا نہیں ہوا ان کا مقام اپنی جگہ آج بھی قائم ہیں ۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لٹریچر کی پاپولیرٹی یا اس کی مقبولیت ہر زمانے میں اس کے اقدار کے مطابق بدلتی رہی ہیں ۔ادب سماج و معاشرے کا آئینہ ہوتا ہیں ۔جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا ، مصروفتیں بڑھی، لٹریچر کی صورت بھی بدلتی رہی۔

لیپ ٹاب ،انٹرنیٹ کا زمانہ ہیں جہاں ایک کلک پر ہمیں دنیا بھر کی معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

فیس بک، وہاٹس اپ ،ٹویٹر ،انسٹا گرام ،یو ٹیوب وغیرہ کے زمانے میں لکھنے کا چلن بھی کم ہورہا ہیں ۔آج کا زمانہ تو وہ ہیں کہ لفظوں کی گنتی کے مطابق لٹریچر لکھا جارہا ہیں 20 لفظوں کی کہانی 100 لفظوں کی کہانی اس کا ادب پر آنے والے وقت میں کیا اثر ہوگا ؟ یہ غور فکر کا مسئلہ ہیں۔

اس کے علاوہ ایک سوال اور جو میرے ذہن میں گردش کرتا ہے کہ بھلے ہی آج الیکٹرانکس ذرائع نے ہمارے زندگی کے ہر گوشے میں اپنا قبضہ جمالیا ہو لیکن پھر بھی فکشن کچھ میدانوں جیسے ناول ،افسانہ لکھنے والے نظر آجاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ فکشن میں دو میدان ایسے ہیں جو ویران نظر آتے ہیں ان میں اول جاسوسی ناول اور دوسرا ڈراما۔تھیٹر وغیرہ میں دلچسپی لینے والے حضرات کے چند ڈرامے بھی کبھی کبھار دیکھنے کو مل جاتے ہیں لیکن جاسوسی ناول کی وراثت کہیں نہ کہیں ختم ہو چلی ہے اردو میں خصوصا جاسوسی ناول نہیں لکھے جارہے۔

اس کے وجوہات جو بھی ہو لیکن نقصان صرف اردو کو ہوا جس کی ایک شاخ اپنی آخری سانس لے رہی ہے۔ایک بار پھر وہی بات جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ یہ کہانی ابن صفی سے ہی شروع ہوکر انھیں پر ختم ہوتی ہے۔

بہر حال !لٹریچر کوئی بھی ہو فائدہ ہمیشہ ادب کو ہی ہوا ہیں اور ہر زمانے میں اس کی اپنی اہمیت رہی ہیں جس سے انکار ممکن نہیں ۔رہی بات ابن صفی کے ناولوں کی تو اس مختصر مضمون میں ان کے طویل جاسوسی سفر کا احاطہ کرنا ممکن نہیں کیونکہ ابن صفی کے تحریر کردہ ناولوں کی بے شمار جہتیں ہیں ،ابن صفی کے اندر بھی فن کے کئی رنگوں کی روح پوشیدہ تھی بحیثیت ناول نگار کے علاوہ بحیثیت نثر نگار ،بحیثیت شاعر ،بحیثیت مزاح نگار آج بھی کئی حوالوں سے ان پر تحقیقی کام ممکن ہیں ۔ہمیں اس طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے تبھی شاید ہم صحیح معنوں میں ابن صفی کو اور ان کی تخلیقات کو سمجھنے میں کامیاب ہو پائیں گے۔

□□□

ابن صفی اور اردو ادب

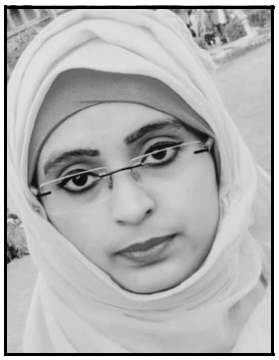

اسریٰ رضوی

علی نگر، بھیک پور
سسوال، سیوان (بہار)
رابطہ: 9696346197

ابن صفی سے میرا لگاؤ بچپن کا ہے جس وقت مجھے ان کے ناولوں اور ادب کو سمجھنے کی بالکل تمیز نہ تھی گھر میں اکثر و بیشتر ابن صفی کا نام سنا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نام سے مانوس ہوگئی عمر کے ساتھ مانوس شدہ شخصیت کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش بھی پنپنے لگی اسی خواہش کے زیر اثر میں انکی تحریروں کی تلاش میں رہنے لگی اور جہاں کہیں بھی انکے حوالے سے کچھ ملتا اس کو پڑھنے لگتی تھی ۲۰۰۳ء یا ۲۰۰۴ء کی بات ہے ھما ڈائجسٹ کے آخیر میں انکے ناول قسط وار شایع ہوتے تھے اور میں اسے پڑھنے کے لئے پورے ماہ انتظار میں رہتی تھی اس زمانے میں ناول محض قلبی لگاؤ یا بطور مشغلہ ہی پڑھتی تھی مجھے اُس وقت تک انکی ادبی قدر و قیمت یا فنی محاسن کی قطعی سمجھ نہ تھی لیکن عمر کے ساتھ ادب کی طرف بڑھتے رجحان نے مجھے دوبارا ان ناولوں کی طرف متوجہ کیا اور میں نے باقاعدہ سمجھنے کی کوشش شروع کردی۔

کسی بھی تخلیق کار کی تصنیف کو پڑھنے سے پہلے اس کے بارے میں کچھ بنیادی معلومات ضروری ہوتی ہے اپنے قارئین کی سہولت کے لئے انکی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتی چلوں کہ اس نایاب ناول نگار کی ولادت ۲۶ رجولائی ۱۹۲۸ء کو ہندوستان کی زرخیز زمین الہٰ آباد کے چھوٹے سے گاؤں نارا میں ہوئی انکا اسم اصلی اسرار احمد تھا مشہور شاعر نوح ناروی رشتے میں انکے ماموں تھے لہٰذا گھر کا ماحول ادبی تھا ابتدائی تعلیم نارہ کے پرائمری اسکول میں ہوئی اور میٹرک ڈی اے وی اسکول الہٰ آباد سے کرنے کے بعد ایونگ کرسچن کالج سے سکنڈری اسکول ایگزام پاس کیا۔ سلسلۂ علم مکمل کرنے کی غرض سے ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا مگر اسی دوران تقسیم ملک کی ہنگامہ آرائی نے پڑھائی کا ایک سال زیاں کرادیا ماحول سازگار ہونے پر انہوں نے دوبارا بی۔اے کرنے کے لئے جامعہ آگرہ میں داخلہ لیا مگر وہاں یہ شرط تھی کے دوسال کا تدریسی تجربہ لازمی ہے تب ابن صفی نے ۱۹۴۹۔ ۱۹۵۲ تک اسلامیہ اسکول جو بعد میں یادگار حسینی کہا جانے لگا میں بحیثیت مدرس ملازمت کی چونکہ انکے والد ۱۹۴۷ء میں دوران تقسیم ہی پاکستان جا چکے تھے اس لئے ۱۹۵۲ء میں ہی وہ بھی اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ پاکستان چلے گئے جہاں انہوں نے کراچی میں لالوکھیت کے سی۔ون میں رہائش اختیار کی اور وہاں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک قیام پذیر رہے۔

انہیں مصروفیتوں کے دوران ابن صفی سنکی سولجر، طغرل فرغان جیسے انوکھے ناموں سے طنز و مزاح کے مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ابن صفی کے دوست عباس حسینی نے ماہ نامہ نکہت کا آغاز کیا تھا جس میں انکی پہلی کہانی فرار شائع ہوئی تھی۔ یہ مختلف ناموں سے طنز و مزاح کی مختصر کہانیاں لکھتے تھے جس کا نام عباس حسینی کے مشورے پر جاسوسی دنیا رکھ دیا تھا۔

ابن صفی کے تخلیق کردہ ادب کو لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں ایک زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اسکی آب وتاب اور جدت جیوں کی تیوں ہے اسی چیلنج کے زیر اثر ابن صفی کے قلم سے انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید جیسے دو ناموراور جیالے کردار ابھرے ان کرداروں کے ساتھ انکا پہلا ناول دلیر مجرم ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا اور عمران سیریز کا پہلا ناول خوفناک عمارت ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آیا جسے راتوں رات شہرت میسر ہوئی۔ انکے ناول ''بھیانک آدمی'' کو ماہنامہ جاسوسی دنیا نے نومبر ۱۹۵۵ء میں الہٰ آباد اور کراچی سے ایک ساتھ شایع کیا تھا۔ ابن صفی نے ۱۹۵۷ء میں اسرار پبلیکیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے تحت پہلے ایڈیشن میں جاسوسی دنیا کا ناول'' ٹھنڈی آگ'' شایع ہوا تھا۔ اسکے بعد اُنہوں نے لالوکھیت سے ناظم آباد میں آکر رہائش اختیار کر لی اور تا وقت رحلت مقیم رہے وہاں جانے کے کچھ ہی عرصے بعد اسرار پبلی کیشن کو فردوس کالونی منتقل کر لیا اس طرح انکو اپنے تخلیقی امور کی انجامدہی میں مزید آسانیاں فراہم ہوگئیں

ابن صفی کے بقول

'میرے صرف آٹھ ناولوں کے مرکزی خیال کسی اور سے مستعار ہیں باقی کے ۲۴۵ ناول مکمل طور پر میرے اپنے ہیں۔'

عباس حسینی کے زیر نگرانی اُنکے ناولوں کی سیریز نکہت پبلی کیشن سے شائع ہوتی رہی ایک دفعہ عباس حسینی نے کانپور سے ابن صفی کے کرداروں کے جعلی ناشروں کے خلاف زبردست کاروائی بھی کی تھی عباس حسینی اور ابن صفی کے درمیان گہری وابستگی کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے:

'جب میری صحت یابی کی کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگی تو یاروں نے شوشہ چھوڑا کہ میرے اور عباس حسینی صاحب کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں اب میری کتابیں ان کے ادارے سے شائع نہیں ہوگی ان بے چاروں کو یہ نہیں معلوم کہ میں ایک درجن کتابیں تو عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کرسکتا ہوں (بشرطیکہ کسی بات پر جھینپ کر مسکرائے ہوں۔'

۱۹۷۷ء میں ابن صفی کا ایک ناول ڈاکٹر دعا گو پاکستان میں فلمایا گیا جو بعض وجوہات کی بناء پر منظر عام پر نہیں آسکا یہ بھی ایک المیہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں ابن صفی کو وہ مقام ومنزلت نہیں ملی جس کے وہ حقدار تھے انکے فن اور حقائق پر بہت کم کام کیا گیا ہے جن بعض ادیبوں نے قلم فرسائی کی ہے ان میں ڈاکٹر اعجاز حسین ادیب ''اردو میں ادب آزادی کے بعد'' ڈاکٹر علی حیدر ''اردو ناول سمت اور رفتار'' پاکستان میں ڈاکٹر سلیم احمد نے ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں انکا ذکر کیا ہے اسکے علاوہ مجنوں گورکھ پوری، محمد حسن عسکری امجد اسلام امجد فیلڈ مارشل ایوب خان وغیرہ بھی ابن صفی کے ذاکروں کی فہرست میں شامل ہیں ایک قابل ذکر اور کافی حد تک تفصیلی جائزہ عارف اقبال کی کتاب ''ابن صفی مشن اور کارنامہ میں موجود ہے جرمن اسکالر خاتون کرسٹینا ہیڈل نے ابن صفی کے فن پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ کہتی ہیں:

''ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے کردار فریدی اور عمران کبھی کسی عورت کی جانب نگاہ بد پھیرتے ہوئے دیکھائی نہیں دیتے ہیں ابن صفی کے جاسوسی ناول کی جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے انوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے اس لئے اسے محض تفریحی ادب نہیں کہا جاسکتا ہے ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے''

مذکورہ بالا تحریر کی میرے نظریہ سے کافی حد تک میل کھاتی ہے اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ابن صفی اردو ادب میں جاسوسی طرز کہ موجد ہی نہیں بلکہ فکری ذہنی اور عملی سطح پر ایک مُصلح بھی ہیں وہ معاشرتی سطح پر رائج غلط کاریوں کے غلط کاری ہونے کی دلیل کے ساتھ ناصحانہ لہجہ سے ہٹ کر دلچسپ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ معمولی سمجھ رکھنے والا بھی غلط کو سبب کے ساتھ غلط سمجھ سکے اور ذہن پر کوئی بار بھی نہ پڑے انکے ناول ''دوسری آنکھ'' سے ایک مکالمہ جو شراب نوشی کے متعلق ملاحظہ ہو:

'کیا تم سچ مچ شراب نہیں پیتے؟

اس نے انکار میں سر ہلا دیا

بڑی عجیب بات ہے۔

میری دانست میں پینا ہی بڑی عجیب بات ہے۔

کیوں؟

اچھے بھلے آدمی کی مدہوشی .....مدہوشی جو خود ہی اپنے آپ پر مسلط کی جائے، حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔'

(ابن صفی مشن اور کارنامہ: از عارف اقبال)

یہ اسلوب اردو میں انگریزی سے داخل ہوا ہے اسکے باوجود بھی جو ربط، تسلسل روانی اور کرداروں کی آپسی ہم آہنگی جو ایک ناول کے پلاٹ کو درکار ہوتی ہے اسکا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ابن صفی کے یہاں موجود ہے وہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے اور ادب میں بد سلیقگی کو بالکل ناپسند کرتے تھے چنانچہ دوسری زبان سے اردو زبان میں ادبی منتقلی کے نقائص کا اظہار ناول ''سیاہ پوش لٹیرا'' میں کرنل فریدی کی زبان سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'آہ واٹسن!! میرے عزیز، فریدی مزاحیہ انداز میں مسکرا کر بولا ۔ خدا منشی تیرتھ رام فیروز پوری کی مغفرت کرے کہ انہوں نے مجھے اردو میں لاکر بات بات پر آہ بھرنے پر مجبور کر دیا ۔ اور میری مٹّی اس طرح پلید کی کہ اردو والے مجھے مولوی شرلاک ہومز مدظلہ سمجھنے لگے میں انگریز کے بجائے لکھنؤ کا باشندہ ہو کے رہ گیا۔'

ابن صفی انگریزی جاسوسی ناول کے اردو ترجمہ کی اس خامی یا بہ الفاظ دیگر ''بلنڈر'' کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

(ابن صفی مشن اور کارنامہ: از عارف اقبال)

الفاظ اور بیان کو لیکر کچھ مشکلیں، دقت پسندی ،اور دقیقیت کا سامنا انکے یہاں کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ اس زمانے کے اشراف مسلمانوں کی معمولی بات چیت کی زبان اور انداز بیان تھا ۔ مگر قاری کا ذہن ان الجھنوں کے باوجود بھی لمحہ بھر کو نہ تو بیزار ہوتا ہے نہ الجھتا ہے بلکہ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مکمل ناول کو پڑھ لینے کے بعد بھی اک کسک سی محسوس ہوتی ہے اور مزید پڑھنے کی خواہش باقی رہ جاتی ہے اور یہی پیاس قاری کو جاسوسی دنیا کے سمندر میں غوطہ زن رکھتی ہے میں کرسٹینا کے خیالات سے متفق ہوتے ہوئے اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ ابن صفی کے تمام کردار ایک دوسرے میں چسپاں اور اپنی جگہ مرصع ہیں مشکل سے مشکل ترین وقت اور نامساعد حالات میں بھی اپنے سر براہ سے بے وفائی یا بے اعتباری کا تصور نہیں کرتے ہیں ہمارے معاشرے کے لئے یہ بات قابل غور ہے انکا ہر کردار عورت کے معاملہ میں انتہائی حساس باوصف اور عصمت پرست دیکھائی دیتا ہے جبکہ مشرقی ناول کا ہیرو کردار عورت ذات سے بغیر متاثر ہوئے مکمل نہیں ہوتا ہے اور ہر کردار میں کہیں نہ کہیں صنف مخالف کی مداخلت لازمی ہوتی ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ ان کا ہر کردار ظاہری اور باطنی دونوں ہی سطحوں پر مکمل ہے صحافت کی دنیا میں انور اور رشیدہ دو ایسے کردار ہیں جو ماڈرن سوسائٹی میں قابل توجہ ہیں یہ اپنی عملی زندگی میں انتہائی ذمہ داری اور ایک جائی کے ساتھ ایک دوسرے وابستہ ہونے کے باوجود بھی دونوں صنفوں کے درمیان ایک حد فاصل ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے اور ان کے کسی بھی عمل سے بے حیائی یا غیر اخلاقی حرکت کا شائبہ نہیں ملتا ہے جبکہ مغربی آب وہوا کا اثر و رسوخ بھی کافی سے زیادہ اانکے یہاں موجود ہے۔ایسی کردار سازی اور ایسا متوازن پلاٹ تیار کرنا کسی عام فنکار کے بس کی بات نہیں ہے فنی سطح پر منظر نگاری اور کردار سازی کی ایک ناول نگار کے لئے بڑی اہمیت ہوتی ہے میں ابن صفی کے ناول سے ایک مختصر سا اقتباس اپنے بیان کی تائید میں پیش کرتی ہوں جس میں یہ دونوں خوبیاں منزل کمال پر ہیں ایک شخص ڈرائینگ روم میں کسی کا انتظار کر رہا ہے اس میں مصنف کا کمال یہ ہے کہ اپنے الفاظ سے ڈرائینگ روم کے ماحول انتظار کرنے والے کی شخصیت اور انتظار کی کیفیت کو قاری کے ذہن میں تصویر کر دے:

'ڈرائینگ روم میں ایک پست قد لیکن بھاری بھر کم آدمی نظر آیا جسکی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ شاید دیوار سے لگی ہوئی ایک پینٹنگ دیکھ رہا تھا حمید کی آہٹ سن کر اچانک مڑا آدمی معمر تھا لیکن خدوخال بچکانہ تھے چہرا بھرا ہوا اور داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا رخسار کی جلد پر ہلکی نیلاہٹ کہہ رہی تھی کہ وہ روزانہ شیو کا عادی ہے آنکھوں میں طفلانہ شوخی کی ہلکی جھلک تھی جو اسکی کشادہ پیشانی کہ پروقار نشیب فراز کی موجودگی میں کسی شعر کی شتر گربگی کی طرح کھٹکتی تھی عمر چالیس اور پچاسکے درمیان رہی ہوگی وہ چائنا سلک کی پتلون اور ہلکی نارنجی رنگ کی قمیص میں ملبوس تھا حمید کو دیکھ کر اس طرح چونک کر خوش آمدید کہنے والے انداز میں مسکرایا جیسے حمید اسکا پرانا شناساں ہو لیکن پھر سنبھل گیا اور چہرے پر فوری خجالت کے آثار نظر آنے لگے۔'

(پرحول سناٹا)

ابن صفی نے عظیم جنگوں کے بعد عوام میں بڑھتی ہوئی مایوسی، عدم اعتمادی اور زندگی سے فرار کی کیفیتوں نے ذہنوں کو مجرمانہ روش سے روشناس کرایا جس کا احساس انہیں بڑی شدت سے تھا لہذا وہ اپنے ناول 'مہلک شناسائی' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

'مستقبل سے مایوسی غلط فہمی کی پیدا وار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے مستقبل سے مایوس ہو کر آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے بڑے سے بڑے چہرے پر مُکا رسید کر سکے اور یہی تلاش ہیرو ازم کی کہانیوں کو جنم دیتی ہے''

(مہلک شناسائی)

اپنے اس نظریہ کے ساتھ انہوں نے ادب کی تخلیق کے لئے معاشرے کا ایک اہم اور سلگتا ہوا پہلو'' ارتکاب جرم'' منتخب کیا کوئی انسان مجرم کیوں بن جاتا ہے؟ 'اور جب کوئی مجرم بن جائے تو اس سے کیسے نپٹا جائے ابن صفی اپنے ناولوں میں ان سوالوں کا جواب پیش کرتے ہیں۔ جبکہ ان سے پہلے کے قلم کار مجرموں سے محض نفرت کا جذبہ ہی ابھارنے میں مصروف تھے ۔ابن صفی نے تو بعض دفعہ ایسے معصوم مجرم کی بھی نقاب کشائی کی ہے کہ مجرم ہونے کے باوجود بھی قارئین کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوگئیں ایسے کردار ''معصوم درندہ'' اور ''ادھورا آدمی'' میں موجود ہیں معاشرتی تہذیب کے حوالے سے ناول '' بزدل سورما'' کے پیش رس میں معاشرتی بیداری اور زندگی گذارنے کی تہذیب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کچھ اس انداز میں رقم طراز ہیں

' آپ اچھے ہوں یا برے جس گھر میں

آپ بیٹھے ہیں اسکے در و دیوار کی حفاظت آپ پر واجب ولازم ہے جس طرح بھی ممکن ہو اسکی حفاظت کیجئے آنکھ کھلی رکھیئے کہیں آپ نا دانستگی میں تو اس گھر کی تباہی کا باعث نہیں بن رہے صوبائی عصبیت ،فرقہ وارانہ منافرتاور دشمنوں کے وار سے بچنے کا سلیقہ تو آپ میں ہونا ہی چاہئے۔'

(بزدل سورما)

وہ مزید اسی اصلاحی موضوع کو اپنی نگارشات کا حصہ بناتے ہوئے ایک دوسرے ناول میں لکھتے ہیں:

'ہر وقت چوکنے رہئے کہ کہیں آپ خود ہی غیر شعوری طور پر دشمن کا آلۂ کار تو نہیں بن رہے ہیں کسی افواہ کو دوسروں تک پھیلانے والا بھی نادانستگی میں دشمن کی مدد کرتا ہے۔

(ہلاکو اینڈ کو)

وہ کس قدر عام فہم ،سادہ اور کم الفاظ میں یہ تمام باتیں قاری کو گوش گزار کرا دیتے ہیں جو ذہن میں آئینہ ہو جاتی ہیں ابن صفی کے ناولوں میں مقصدیت کی موجودگی بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے جرم کی سطح پر بلیک میلنگ ،اغوا، اسمگلینگ ہو یا ملک سے غداری ہر سطح کے جرم اور انسداد جرم اخلاقی معاشرتی سطح پر عورتوں کی عزت و احترام ، بزرگوں کی اطاعت، چھوٹوں اور ماتحتوں پر شفقت ،مجبوروں اور محتاجوں پر صلۂ رحمی اپنے ملک کے افسران کے ساتھ وفاداری ان تمام ضروری باتوں کا اس دل پذیر انداز میں ہنستے کھیلتے درس دیتے ہیں ایسا اسلوب ابن صفی کے ناولوں کے علاوہ کسی اور مصنف کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ وہ انسان ہونے کی سطح پر بھی انتہائی بردبار اور حلیم الطبع تھے لہٰذا طویل بیماری کے دورانئے نے کئی ابنوں اور صفیوں کو پیدا کیا لیکن انداز تحریر چیخنے لگا یہ اصلی ابن صفی نہیں ہیں وہ خود اس صورتحال پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:

'رہی مختلف قسم کے ابنوں اور صفیوں کی بات! تو بیچارے سارے قافیے استعمال کر چکے لہٰذا مجھے اب کسی ابن خفی کا انتظار ہے۔'

ابن صفی کا فن اور شخصیت مستقل مطالعہ اور مسلسل تبصرے کا متقاضی ہے اس مختصر مضمون میں انکی فکری جہات اور فنی ترجیحات کو سمیٹ پانا مثل سمندر کو کوزے میں سمیٹے جیسا ہے وہ بھی مجھ جیسی کم مایہ کے لئے مبصرین اور ناقدین نے رومانی ادب ،صوفیانہ ادب، فلسفیانہ ادب حد یہ کے فحش ادب کو اپنے ورطۂ غور فکر میں سمیٹا مگر نہ جانے کیوں جاسوسی ادب سے دامن کش رہے میرے خیال سے تجسس ہی وہ جذبہ ہے جو صفحۂ ہستی پر انسان کی ارتقاء کا ضامن ہے جو ذہن جذبۂ تجسس سے عاری ہوتا ہے اُسے معطل (Handicap) کہا جاتا ہے دانشوروں اور فلسفیوں کے مطابق تجسس ہی انسان کی ذہنی و جسمانی نشونما کا سبب ہوتا ہے عالم موجودات میں ورود کے بعد انسان کی اولین کیفیت یہی تجسس ہوئی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے لفظوں میں کچھ یوں بیان کیا ہے

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائل گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

اہل عقل وہوش کا ایک طویل مدّت کے بعد ابن صفی کے فن پاروں کی جانب غور وفکر کرنا اور متوجہ ہونا انکے فن میں مقصدیت کی موجودگی کو محسوس کرنا ہی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ابن صفی اپنے زمانے سے آگے کا شعور رکھتے تھے جب عام انسانیت شعور اور آگہی کی اُس منزل سے قریب ہوئی تو اسے اُنکی آگہی حاصل ہوئی یہ معاملہ صرف ابن صفی کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ ہر مدّبر و مُصلح کو اپنے دور میں ناشناسائی کی اذیت سے دوچار ہونا پڑا اور عرصۂ دراز کے بعد آنے والی نسلوں نے اسے سمجھا اور پہچانا ہے

'زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'

اتنی برقی اور مقناطیسی صلاحیتوں کے حامل شخص نے بھی اپنی زندگی کے آخری چند سال بڑی تکلیف اور پریشانی میں گزارے۔ اسکے باوجود ہمت اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک مسلسل تین سال تک وہ مرض میں مبتلاء رہے پھر حکیم محمد اقبال حسین کی علاج سے صحت مند ہو گئے اور عمران سیریز کا ''ڈیڑھ متوالے'' پوری توانائی سے مکمل کیا مگر ۱۷ ستمبر ۱۹۷۹ء کی رات کو اچانک شدید درد کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اسکے بعد مسلسل طبیعت ناساز رہنے لگی دو ماہ کی مدّت میں بیماری شدت اختیار کر گئی ڈاکٹروں نے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا تو انکو کراچی کے جناح اسپتال میں داخل کرایا گیا وہاں کچھ ٹیسٹوں کے بعد معلوم ہوا لبلبہ میں کینسر ہے یہ بات گھر والوں سمیت ابن صفی سے بھی پوشیدہ رکھی گئی صرف انکے بیٹے احمد صفی کو اسکا علم تھا ۲۴ جولائی کو آپکی طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہوگئی اور ٹھیک دو دن بعد یعنی عین اپنی سال گرہ والے دن ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو دار فانی سے رخصت لے لی۔ انتقال کے بعد بھی آپکے چند ناول نکہت پبلی کیشن سے شائع ہوئے اُن میں سے ایک ''سائے کا قتل'' ہے جس پر بعض ناقدین ومبصرین کو ابن صفی کی تصنیف نہ ہونے کا شبہ ہے

ابن صفی کی وہ چند ناولیں جو مجھے پسند ہیں ''جونک کی واپسی''، صحرائی دیوانہ، خطرناک لاشیں، دشمنوں کا شہر، جہنم کی رقاصہ، زمین کے بادل ، وغیرہ۔ اب میں اپنا مضمون ڈاکٹر شمس بدایونی کی تحریر پر ختم کرتی ہوں:

''میرے لئے وہ ایک معلم راہبر اور استاد کا درجہ رکھتے ہیں جس نے میری زبان و بیان کو درست کیا ذہانت کو بروئے کار لانے کا ہنر سکھایا شخصیات کو انہی کی حدود میں پیش کرنے کا سلیقہ دیا خبر کے پیچھے چھپی خبر پر نظر ڈالنے کی عادت دلائی انسانی شخصیت کی پیچیدگیوں ،تضادات اور گناہوں کے پس پشت خاندانی محرومیوں کو سمجھنے کا طریقہ سمجھایا بھر سب سے بڑی بات زندگی کو فطری قوانین کے دائرے میں جینے کا حوصلہ دیا۔

□□□

کاغذ نم رہا

احمد وصی

K-304، پمپ ہاؤس، اندھیری ایسٹ، ممبئی

موبائل: 9833094497

صبح سے پہلے سمٹتی ہوئی جاتی ہوئی رات
راز داری سے بیاں کرتی ہے چپکے چپکے
خواب وہ خواب کہ جن کی کوئی تعبیر نہیں
وقت کے دوش پہ سر رکھ کے سسکتے لمحے
ان کا ہی ذکر کیا کرتے تھے رُک کر ایسے
نیند میں آتی ہوئی جیسے اذاں کی آواز
شنکھ بجتا ہوا جیسے کہ کسی مندر میں
تھوڑی جاگی ہوئی حِس تھوڑی سی سوئی ہوئی حِس
کبھی اُجلی کبھی تاریک ہوئی جاتی ہے
میں سمجھتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں سمجھا میں نے
لیکن اتنا تو سمجھتا ہوں بھٹکتا ہوں جہاں

اُن سرنگوں سے گزر کے ہی وہ دن نکلے گا
جسے ان خوابوں کی تعبیر کہا جائے گا
میں اجالے میں کھڑا پاؤں گا مجرم خود کو
جرم میرا یہی ہوگا کہ میں بے خوابی کا
بھیگتی آنکھوں کو الزام دیا کرتا ہوں
اور مجھ سے ہی کہا جائے گا انصاف لکھو
تب لگے گا مجھے اک خواب کا یہ منظر ہے
موت دینے کی سزا اپنے لئے لکھ کر خود
میں نے بھیگے ہوئے کاغذ پہ قلم توڑ دیا
ایسا کاغذ کہ جو نم کل بھی تھا
نم آج بھی ہے

ان کہی بات

نہ تیرے لب
نہ میرے لب
نہ کسی اور کے لب
بات وہ نہ آسکی
جو بیٹھی تھی، دل کے تہہ خانوں میں
نہ تو
نہ میں
نہ کوئی اور
کچھ بھی سمجھ نہ سکا
اور وہ گزر گئی۔ بے آواز دست و پا
پھر
تو
میں
اور
ڈھونڈتے رہے پاس سے گزری ہوئی آواز کو
جو خاموش تھی
ان کہی باتوں کی طرح

احمد سہیل
278/B، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی
موبائل: 9852842597

قافلہ چلا تو تھا

قافلہ چلا تو تھا
کہاں گیا، کدھر گیا
پتہ نہیں!
جو قافلے کے ساتھ تھے
ہاتھ دے کے ہاتھ میں
وہ ہم قدم وہ ہمنوا
مرے جئے خبر نہیں
جو ہوا غلط ہوا
مانتے ہیں سب مگر
بے بسی عجیب ہے
بے حسی نصیب ہے
میں بھی اس کا شکار ہوں
کیا کروں میں کیا کروں
سوچتا ہوں رات دن
قافلہ چلا تو تھا
شفقتوں کا قافلہ
محبتوں کا قافلہ
رفاقتوں کا قافلہ
خوشبوؤں کا قافلہ
چلا تو تھا مگر
کہاں گیا، کدھر گیا
پتہ نہیں! پتہ نہیں!

رفیعہ جعفر
رنجیت سنگھ کالونی، تالوکا مول، پونہ
موبائل: 9270916979

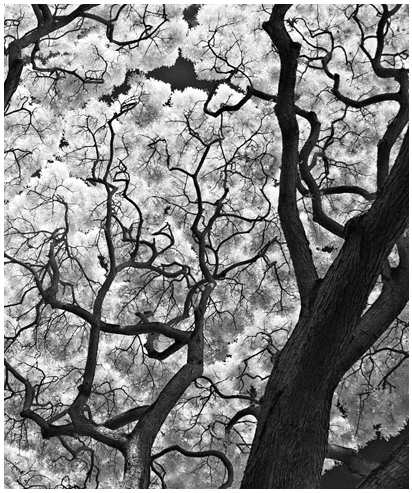

شاید

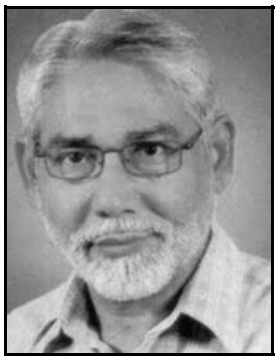

پروفیسر حسین الحق

سرسید کالونی
نیو کریم گنج، گیا (بہار)
رابطہ: 9934066270

پتہ نہیں! بھو کا دھندلکا تھا یا شام کا ملگجا پن!

مٹی کا ایسا رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔

مجھے یہاں رکنا نہیں تھا مگر رک گیا، یاد نہیں میں رکا یا مٹی نے روکا۔ یہ مجھے ہمیشہ پریشان کرتی رہی ہے۔اس کی وجہ سے کتنی مرتبہ اماں سے ڈانٹ سنی، ابا سے مار کھائی۔سب دوست جب اکٹھا ہوتے تو یہ جیسے اشارہ کرتی، نہ جانے بھول چوک یا جان بوجھ کر ہاتھ پیر اس کے رنگ میں رنگ جاتے، ٹھیک ہی ہے۔ہاف پینٹ یا جانگھیہ کی وجہ سے پیر اس میں مل جاتا مگر شرٹ یا قمیص تو آستین دار ہوتی تھی؟ پر کیا کرتا جب سب دوست شرٹ اتار اتار کر درخت کے تنے پر ٹانگتے تھے تو مانو آپ ہی آپ میری قمیص تنے پر ٹنگ جاتی۔ورزش، کسرت اور پہلوانی کا شوق ہوا تو استاد کی ہدایت کے مطابق قمیص، لنگی دونوں کسی تنے یا کھونٹی پر اور ہم سب جسم پر گویا مٹی کا پاؤڈر لگا لیتے، لنگوٹ یا انڈویر کا رنگ بھی خاکی رنگ ہو جاتا۔کبڈی کھیلتے ہوئے تو مٹی میں لوٹ لوٹ کر جیت کی تمنا کی جاتی۔

مٹی کا ایسا رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے جھک کر دیکھا، مٹی میں کچھ بے چینی محسوس ہوئی۔ وہ معمولی نہیں تھی۔ اس کو کاہے کا دکھ ہے؟

مٹی کچھ بولتی ہوتی تب نا بولتی، میں نے اس پر پیر، ہاتھ کے دباؤ کی طرح رکھا تو لگا، پیر کے نیچے صرف مٹی نہیں ہے، جھک کر دیکھا، ماں بن گئی تھی۔ کچھ اپج گیا تھا۔

کیا ہے رے؟ جو تیرے کو اشانت کر رہا ہے؟ جب اپنا سراپا پھیلائے پڑی تھی، تب نہ سوچا کہ کوکھ سے گلاب لے کر کچھ بھی اُگ سکتا ہے!

پھر خیال آیا کہ مٹی تو اپنا آپا سراپا مالی کو سونپتی ہے، مالی کہاں ہے؟

نزدیک و دور......نرجن بن......سناٹا...... اور اس کا رنگ؟

پتہ نہیں: بھوٗ کا دھندلکا تھا یا شام کا ملگجا پن، میں نے جھک کر دیکھا، اسے ملگجا پن نہیں کہا جا سکتا، ایسا رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا، کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسا ہو، کسی طرف سے پانی، کیچڑ یا بہاؤ کی ڈھلان پر بہنے والے

کسی اورعنصر کے بہہ بہہ کر اس میں گھل جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟ اس کا ایسا رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔

مٹ میلا؟ نہیں.....

ڈوبتے سورج جیسا؟ نہیں.....

مہندی؟ اوں ہوں.....

کوئی تیز نوکیلا کانٹا چبھ جائے تو..... پتہ نہیں

مٹی کا ایسا رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔

نیچے کچھ حرکت بھی محسوس ہوئی۔ کیچوا، چیونٹی، کوئی مکھی یا مچھر جو شاید اڑنے کے قابل نہیں..... حالانکہ مٹی تو گھاس میں چھپا کر بھانت بھانت کے جانداروں کو سانس لینے اور حرکت کرتے رہنے کا موقع دیتی ہے مگر ابھی تک کسی کیڑے نے کاٹا نہیں تھا۔ کیا زمین پر رینگنے والے کاٹنے سے توبہ کر چکے؟ یا عادت بدل گئی؟

تبھی نگاہ پڑی۔ ایک چھپکلی نے ایک کیڑے کو نگل لیا تھا۔

اسی لمحہ ایک خرگوش بھاگتا ہوا سامنے سے گزرا۔ خرگوش بھاگ رہا تھا۔ میں اپنے اس بیان کے بارے میں ذرا مشکوک ہوں۔ یاد آتا ہے کہ وہ کچھ لنگڑا رہا تھا اور اس کے بدن کے کسی حصے سے خون بھی رِس رہا تھا۔ کہیں پر زخم کے نشان جیسا بھی کچھ تھا۔

کسی حصے کی کھال ادھڑی ہوئی تھی۔ ایسے میں کوئی بھاگ کہاں پاتا ہے؟ مگر ایسے میں بھاگنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے!

خرگوش جس طرف سے بھاگتا ہوا آیا تھا، میں نے ادھر نگاہ کی، مٹی آگے لمبی گھانسوں اور جھاڑیوں میں گھری ہوئی..... اس کے آگے گھنے جنگلوں کا سلسلہ.....

مٹی بولتی ہوتی تو شاید سیاپے کی آواز بھی آتی، میں نے جھاڑیوں سے گھری دھند اور اندھیرے میں قید جنگل کو محسوس کیا۔ مجھے یہاں رکنا نہیں تھا مگر مٹی کی کنمناہٹ نے مجھے مجبور کیا۔ مٹی کنمنا رہی تھی یا کسمسا رہی تھی یا چھٹ پٹا رہی تھی۔

نقوش ایام

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'نقوش ایام نمبر' بھی شامل ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اسکی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۳۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

مٹی کبھی کبھی گنگناتی بھی تو ہے؟

میں نے کان لگایا..... دل میں ہول پیدا کرتی ایک لمبی چپ!

یا شاید کچھ سنسناہٹ..... کیا یہ پانی کھولنے کی آواز ہے؟

یا ہنکار..... کیا جنگل میں عفریت سانسیں لے رہے ہیں؟

خرگوش بھاگ رہا تھا مگر بھاگ نہیں پا رہا تھا، مجھے یہاں رکنا نہیں تھا مگر شاید مٹی روکتی ہے، کچھ کہنا چاہتی ہے، کچھ سننا چاہتی ہے۔

کون کیا کہہ پایا اور کون سن پایا؟ مگر مجھے تو کہنا ہے، بتانا ہے کہ خرگوش زخمی ہو گیا ہے، پھر بھی اسے بھاگنا پڑ رہا ہے۔

مجھے رکنا نہیں تھا، میں مٹی کے سہارے اپنے آگے بڑھنے کو محسوس کر پا رہا تھا، مگر مجھے رکنا پڑا، اچانک ہی رکنا پڑا، تلووں کو گرمی کا احساس ہوا، مٹی ہی تو ہے، یا کوئی انگارہ؟ اس کی کوکھ میں انگارے کس نے ڈال دئے؟

بے سوچے سمجھے میرے قدم تیز ہو گئے، پھر میں نے محسوس کیا کہ میں بھاگ رہی ہوں، میں نے مٹی سے خود کو کاٹا نہیں تھا، میں مٹی سے کٹ کر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں مٹی سے مٹی کی طرف بھاگ رہا تھا اور مٹی میرا تن من جھلسا دینے پر تلی ہوئی تھی۔

شاید آتش فشاں؟ مگر نہیں..... دور دور تک کہیں آتش فشاں دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی زمین دھدھک رہی تھی۔

بھاگتے رہنے کے علاوہ چارۂ کار کیا تھا؟ اس کے پاس پہنچنا تھا، اس کو بتانا تھا کہ چاروں طرف کیڑے رینگ رہے ہیں، خرگوش زخمی ہو گیا ہے اور سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔

مگر اس کا کوئی پتہ نشان نہیں..... اپنی ابتدا سے آج تک.....

اور مٹی کے اندر بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ مٹی کا ایسا رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔

□□□

اہم موڑ

پروفیسر شاہ محمد وسیم

1، اُحد ریزیڈنسی، فیز-1
دودھ پور، علی گڑھ
رابطہ: 76175

رشتہ داری کی بات نہ ہوتی تو شاید وہاں جاتا بھی نہیں۔ کئی جذبات بیک وقت امنڈ آئے تھے۔

جاؤں یا نہ جاؤں!

رشتہ داری کا معاملہ ہے، جانا ضروری ہے، ایک آواز آئی اور دوسری آواز بھی 'ہوا کرے، میرا دل، میں نہیں جاؤں گا' خیالوں کی ٹھیکیداری کا زمانہ ابھی تک تو نہیں آیا ہے۔

لیکن دل نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

شام تھی، دھندلکا سا چھا چلا تھا۔ موسم اس دن خوشگوار تھا، ایسا لگتا تھا کہ فضا اور بے خودی میں دیوانہ وار چلتی ہوئی ہوا چاہتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑائے۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ کرنا تو یہ تھا کہ لباس تبدیل کر کے میں نوید کے گھر چلا جاتا اور پھر وہاں سے بارات کے ساتھ اس کے سسرال جاتا اور باراتی بن کر وہاں بیٹھتا اور خوب خدمت کرواتا، پان لانا بھئی! ذرا ماچس دے سکتے ہیں آپ، سگریٹ نکالتے ہوئے ایک دو بار کہتا لیکن جذبات کے ہجوم اور خیالات کی کشمکش میں وقت کا خیال ہی نہ رہا اور یہ وقت آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بارات جا چکی ہوگی، اس کے باوجود میں نے جانے کی ٹھان ہی لی کیونکہ اگر میں نہ جاتا تو دوسرے رشتہ دار تو جو کہتے سو کہتے ہی، مگر ونود کیا سوچتا اپنے دل میں! رشتہ داری کے علاوہ وہ ایک اچھا ساتھی اور دوست بھی تھا۔

لباس تبدیل کر کے میں گلنار کی طرف چلا گیا، یہی وہ گھر تھا، جہاں ونود کی شادی ہونے والی تھی۔ میں خاموشی سے اسی طرف چلتا رہا۔ خیالوں کے ہجوم آئے اور گئے۔ مجھے کالج کی وہ زندگی یاد آئی جو میں نے صبیحہ کے ساتھ ساتھ گزاری تھی اور آج مجھے اپنے ماضی کو تخئیل کے سہارے دیکھتے ہوئے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ونود کا رشتہ ودیا سے ہونے والا ہے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ عورت ذات جذباتی ہوتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو ضرور ایک جذباتی لڑکی کی طرح مجھے خط لکھتی، اپنے غم میں مجھے شریک کرتی یا کم سے کم اپنی مجبوری ظاہر کرتی۔

مجھے شک تھا کہ شاید ونود کا رشتہ کسی اور سے ہو رہا ہے۔ ودیا کے علاوہ اس کی کسی اور بہن سے۔ یہ شک لمحہ بہ لمحہ یقین میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا، کیونکہ ونود نے بھی مجھے کچھ بھی نہ بتایا تھا۔

پھر مجھے گلنار کی وسیع عمارت نظر آنے لگی تھی۔ وہ سب خیال اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے آتے جاتے تھے۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے، چیخ و پکار تھی، انسان زندگی کے ایک اہم موڑ موقع پر جشن مسرت میں جو لگا ہوا تھا۔ شہنائی بج رہی تھی، موسیقی کی آواز گونج رہی تھی۔ میرے ذہن میں ودیا کی آواز اور خود اپنی آواز بھی یاد بن کر ابھری، جو اب تک فقروں کی طرح گونج رہی تھی۔ جانے کیوں میری چال ذرا سست ہوگئی۔ یقین و شک کے باہم خیالوں میں میں نے گیٹ تک جا کر ایک لمحہ کے لئے ادھر ادھر دیکھا اور کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔

ہیلو، ہیلو کی آوایں بلند ہو رہی تھیں۔ کتنے ہاتھ تھے جو سلام کے لئے اٹھے اور کتنوں کو خود میں نے سلام کیا۔ اکثر لوگوں نے جن میں بزرگ اور ہم عمر سب ہی شامل تھے، اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی تھی لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ونود کے پاس جا کر بیٹھوں اور دیر سے آنے کی معذرت ذرا کچھ خوبصورت انداز سے کروں اور ہوا بھی ایسا ہی۔

اتفاق سے نوید ہی کے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب اٹھ کر کہیں چلے گئے، میں نے موقع کو غنیمت جانا اور تیزی کے ساتھ چل کر ونود کے پاس پہنچ گیا۔

ہے لو ونود..... دیر کیوں ہوئی، ارے تو تو بارات میں نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے کہ: ہوں تو! ذرا کچھ لوگ بے موقع گھر آ گئے تھے۔ یہ کہہ کر میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

وسیع شامیانہ کے نیچے بیٹھے ہوئے خیال آیا کہ انسان ی زندگی میں کتنا تضاد ہے۔ میں ونود کا رشتہ دار ہوں۔ کہنے کو میں اور ونود اور سب لوگ ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں لیکن ہمارے مسائل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ہم ایک نہیں ہو سکتے۔ اگر دولت کے اعتبار سے لوگوں کو اپنایا جائے تو بھی نہ جانے کتنے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر شکل وصورت کے لحاظ سے دنیا میں گروہ بندی کی جائے تو بھی نہ جانے کتنے اپنے غیر ہو جائیں گے لیکن ایک جذبہ ہے، جو دوسروں کو بھی اپنا بنانے کی لامتناہی طاقت رکھتا ہے اور وہ ہے محبت وانسانیت کا جذبہ کہ اس کے ذریعہ دنیا میں گروہ بندی کی کوشش کی جائے تو دنیا ایک نظر، جی ہاں! ساری دنیا..... میں انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ اتنا اور اس طرح کہ شامیانے کے نیچے خوشی سے سرشار ادھر ادھر دوڑتے ہوئے بچوں کی طرف بھی میری نظر نہ اٹھی۔ میں یہ بھی نہ کر سکا کہ دوڑ کر ان میں سے کسی کو پکڑتا، ہنساتا۔ وہ چیخ بلند کرتا اور میں اسے چھوڑ دیتا۔

تعجب مجھے اپنے آپ پر ہی نہیں، ونود پر بھی ہو رہا تھا جو مستقل خاموش تھا۔ میری بات تو اور تھی۔ میرے خیالوں کے بنائے ہوئے محلوں کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور مجھے انتظار تھا اس گھڑی کا کہ جب یہ سب کچھ جو میری اپنی نظروں میں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ ایک بارات .....شور وغل.....چیخ و پکار..... جذبات میں ڈوبی ہوئی باتیں.....منچلوں کی پسند کے وہ گیت جسے وہ ریکارڈ پسند کر کر کے بجوا رہے تھے اور منتظر تھے اس راستہ سے خوشی سے سرشار دلہن کے اعزا و اقربا کے باہر نکل آنے کے، کہ وہ آئیں اور مہمانو کو خوش آمدید کہیں اور اندر اس وسیع ہال میں آنے کی دعوت دیں جہاں خواص پہلے ہی سے تشریف فرما تھے۔ فضا میں خوشبوئیں رچ بس گئی تھیں، جو ہوا کے دوش پر سوار ادھر سے ادھر، اُدھر سے اِدھر آ جا رہی تھیں۔

عجب رعنائی انداز سے اٹھتے ہوئے دلہن کے قدم، ذرا جھکے ہوئے کندھے اور گرے ہوئے ہاتھ! یہ سب دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے بھی شاید میں نہ تو کچھ دیکھ پاؤں گا اور نہ کچھ سن پاؤں گا کیونکہ مجھے ودیا سے پیار ہے، بے انتہا پیار..... یہ سب سوچتے ہوئے بھی مجھے لمحہ بہ لمحہ جانے کیوں ایک امید سی بندھ جاتی تھی۔

'پاگل ہوئے ہو!' اندر سے آواز آئی۔ 'ارے! یہ ودیا نہیں، کوئی اور ہے جس سے ونود کا رشتہ ہو رہا ہے۔' جیسا بھی ہو، میری قسمت۔

میں یہ سوچتا اور تب میں دور .....بہت دور چلا جاتا تھا۔ تصور کی حسین اور شاداب وادیوں میں۔ لیکن بے کیفی جب حد سے گزر جائے تو حسین تخئیل کا سرور وسکون بھی دیر پا نہیں ہوتا۔ مجھے اس وقت اپنے سینہ پر ایک طرح کا دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک شور سا اٹھ رہا تھا۔ ایک طوفان سا برپا تھا جن کی وجہ سے صرف میں پریشان تھا۔ اور کون تھا جو میرے ساتھ ان طوفانوں میں۔ اس شور میں میری طرح پریشان ہوتا۔ ہاں.....ایک ودیا بھی تھی۔ تو میرے سامنے نہ تھی۔ اور تھی بھی تو اس طرح کہ نظریں جھکی ہوئی تھیں اس کی اور ایک خوبصورت سجی سجائی دلہن بن کر میرے سامنے ہاتھ میں پھولوں کا ہار لئے کھڑی تھی۔ سر جھکائے اور ان میں میرے لئے کوئی خوشبو نہ تھی اور نہ کوئی کشش۔

میرے دل نے مجھے للکارا کہ میں مجمع کو چیرتا ہوا ودیا تک پہنچ جاؤں اور چلا چلا کے کہوں:

تم نے تو میرے ساتھ زندگی.....

اور پھر اس کے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا کیونکہ لوگ اٹھ کر اس راستہ کی طرف جا رہے تھے جس طرف سے دلہن آنے والی تھی۔

▼▼

'.....ارے من میں لڈو.....'

'نہ بول ری سکھی کہ چلی پیا.....'

'ارے بھئی مت چھیڑو اس کے.....'

'وڈیاری.....'

اور ودیا سر جھکائے چل رہی تھی۔ نوجوان اور الھڑ لڑکیاں اس پر خوشیوں اور جذبات میں ڈوبے ہوئے لفظوں کی بوچھار کر رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی۔ 'زندگی کے سفر میں صرف خوشیوں ہی سے ہمکنار کون ہوتا ہے؟ زندگی ایک طویل شاہراہ ہے، جس میں پھولوں کی خوشبو، دلکش مناظر اور بکھرے ہوئے کانٹے بھی ہیں۔ اسی طویل رہگزر پر چلتے چلتے زندگی کی حسین ودلفریب رات ختم ہوجاتی ہے اور.....'

اور ادھر میں نے سوچا کہ کاش یہ سب میں آج اکیلے نہ دیکھ رہا ہوتا، میرے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا! ودیا جب جے مالا ڈال چکتی تو ودیا کو مبارکباد کہنے کے لئے میں خود نہ جا کر اسے بھیجتا جو اپنا تعارف یہ کہہ کر کرتی: 'ودیا جی! مجھ سے ملئے۔ مسز نریش' اور ودیا کے دل پر برق سی کوند جاتی، تکرار ہوتی، 'مسز نریش، مسز نریش' اور وہ گھبراہٹ میں کچھ نہ کہہ پاتی! اور اس کے بعد میں کچھ اور نہ سوچ سکا کہ ونود کا بازو میرے بازو سے ٹکرا رہا تھا، وہ گرا پڑ رہا تھا۔ میں نے ایک بوجھ سا محسوس کیا اور نہ جانے کیوں میں گھبرا گیا، میں نے اس کی طرف بغیر دیکھے ہوئے آہستہ سے کہا:

'ونود یار! ایسے متوالے نہ بنو، ذرا ٹھیک سے بیٹھو، مجمع کیا کہے گا۔'

'کیا؟' اس نے عجب سے لہجہ میں کہا۔

میں نے کہا 'ٹھیک سے بیٹھو۔' اس طرح جو کہا تھا، اسے دہرا دیا۔

'ارے ہٹ.....ہٹ.....ٹ.....رے۔' وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

اور پھر میں یہ بھول گیا کہ ونود مجھ پر لدا آرہا ہے کیونکہ رشتہ داروں کے جھرمٹ میں دلہن سامنے سے آرہی تھی۔.....ودیا.....ودیا، میرے دل ودماغ پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔ میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے اٹھ کر کہیں اور بلکہ منڈپ سے باہر چلا جاؤں۔ اتنی دور کہ ان سارے لوگوں میں سے کسی کو بھی نہ دیکھ پاؤں، ودیا کو بھی نہیں، بلکہ اس کے سائے کو بھی نہیں!

'لیکن یہ بھی کوئی بات ہوئی!' میرے اندر سے آواز آئی۔ اگر بازی جیتنے والے کی طرح نہ سہی تو بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح بھی تو لوگ اس دنیا میں اسٹیج پر آبیٹھتے ہیں۔

اور پھر میں نے دل کو سمجھایا اور رکنے کی ٹھان لی۔

اب ونود مجھ پر لدتے لدتے سنبھل کے سیدھا بیٹھ گیا تھا، ودیا خاموش کھڑی تھی، ہاتھ میں جئے مال لئے۔ میں نے بازی ہارے ہوئے جواری کی طرح نظریں جھکالیں اور میں سب کچھ بھول گیا، میرا سر جھکا ہوا تھا، ونود کھڑا ہوا تو اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

'ارے ڈال ری.....ڈال دے جئے مال.....' ایک سہیلی نے کہا۔

'ذرا جھکاؤ تو اس لمبے دولہا کو.....' دوسری نے کہا۔

'ارے ذرا جھک جایئے سرکار.....' ایک دوسری نوعمر لڑکی نے کہا۔

'جھوک جآ آیئے.....کیوں.....ری.....کیوں.....؟' ونود نے اپنے ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے لمحہ ہی ودیا نے مالا ونود کی گردن میں ڈال دی۔

فضا میں ایک بہکا ہوا قہقہہ بلند ہوا۔ وحشی پن میں ڈوبا ہوا قہقہہ اور ودیا ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ ونود بری طرح ہنس رہا تھا۔

میں نے سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ودیا نے آنکھیں کھول کر ونود کو دیکھا پھر یقیناً پہلی بار اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس یک حسین پررونق چہرے پر عجب سے جذبات کے تاثرات نمایاں ہوئے، آئے اور گئے، کئی رنگ ابھرے اور ابھر کے ڈوب گئے۔ شاید وہ کسی الجھن میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ شاید وہ اپنے پتاجی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ونود نشے میں تھا اور ودیا زندگی کے ایک اہم موڑ پر۔ اسے فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا اور آنکھوں کو زور سے بند کرلیا۔ نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں نے باہر جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ دوسرے ہی لمحہ میں نے اپنی گردن پر ایک بوجھ سا محسوس کیا۔ میرے کندھے جھک گئے۔ ایک گراں بوجھ سے شاید۔ ودیا نے میرے گلے میں مالا ڈال دی تھی۔

اور وہ مجھے اپنی نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ مجمع میں ایک شور تھا۔

'غلطی سے.....'

'اجی نہیں اسکول کی پڑھی ہے نا.....!'

'ارے صاحب! نہیں پہلے سے کچھ تھا.....'

'ارے بھائی! اس غلطی کو سدھارا جاسکتا ہے!'

'دوسرا ہار لایئے.....'

'یہ زندگی بھر کا فیصلہ ہے۔ دلہن سے پوچھا جائے.....'

اور پھر گھیر لیا ودیا کو مرد اور عورتوں نے۔ درجنوں سوال ہوئے اس سے۔

'ارے تجھے ہار کس کے گلے میں ڈالنا تھا اور تو نے غلطی سے.....'

یہ سن کر ودیا نے گھبرائی ہوئی مگر پراعتماد آواز میں اتنا کہا۔

'نہیں پتاجی..... یہ فیصلہ میں نے بروقت کیا ہے۔'

ادھر ونود نے نشہ کی حالت میں مجھ پر ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ لوگ اسے سمجھا بجھا رہے تھے اور مجھے ونود کے سورگ واسی پتاجی یاد آرہے تھے، جن کی بے انتہا دولت کا اکیلا مالک ونود تھا۔ اکیلا مالک!

□□□

روٹیوں کی قید میں

بشریٰ صدیقی

ریسرچ اسکالر
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
رابطہ: 9208168898

''اماں جلدی میں ہوں پھر بات کروں گا۔''

بات کرنے کا دل تو تھا پر وقت اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ زندگی بھی کیا خوب ہے کہ جس کی گود میں پلے اسی کے لیے وقت نہیں۔

شہر کی بھاگتی ہوئی زندگی میں سب کچھ ہے سوائے وقت کے۔ سمیع اپنی سوچوں کو جھٹکتا ہوا پھر کام میں لگ گیا۔ آج ہر حال میں آرڈر پورا کرنا تھا۔

آج سے دس سال پہلے سمیع گاؤں سے شہر آیا تھا۔ آگے پڑھنے کی للک، تنگ دستی سے پار پانے کی چاہت آئے دن کی فاقہ کشی سے نجات پانے کے لئے اس نے شہر کا رخ کیا تھا۔ دو سال سے گاؤں میں پانی کی ایک بوند بھی پیاسی زمین پر نہ پڑی تھی۔ اچھی خاصی کھیتی چوپٹ ہوگئی تھی۔ تالاب سوکھ چکے تھے۔ جہاں پینے کے پانی کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی تھی تو کھیتوں کو پانی کہاں سے ملتا۔ سرکاری ہینڈ پائپ سے بھی اب پانی کی جگہ بالو آنے لگا تھا۔ پورا کا پورا گاؤں بدحالی کا شکار تھا۔ پینے کے پانی کا انتظام تو کسی طرح مرکھپ کر ہو جاتا تھا پر اب روز روز کے فاقوں سے جان پر بن آئی تھی۔ کسان کی اصل دولت اس کے کھیت کا اناج ہوتا ہے۔ پر جب زمین بنجر ہونے کے کگار پر آجائے تو بانجھ عورت کی طرح وہ سونا نہیں اگلا کرتی۔ اس پر قحط کی یہ مار زخم پہ نمک چھڑکنے کی طرح تھی۔ گاؤں والوں نے بھی ادھار دینا بند کر دیا تھا۔ کیونکہ سب اسی قحط کے شکار تھے۔ اناج خرید کے جو کھانا پڑتا تھا۔ ان داتا کو ہی اناج خریدنا پڑے اس سے برا کیا ہو سکتا ہے۔

کچھ حالات سے بیزار اور کچھ حالات بدلنے کی چاہت لئے سمیع گاؤں سے شہر کی جانب چل پڑا تھا۔ بچپن سے شہر کی رنگینیوں کا قصہ سنتا آیا تھا۔ پورے گاوں میں وہ پڑھنے میں سب سے اچھا تھا۔ انٹرمیڈیٹ اول درجے سے پاس کیا تھا آگے پڑھنا چاہتا تھا پر حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ سمیع شہر آیا تو چار پیسے کمانے کے لئے تھا پر شہر آکر سب سے پہلا کام اس نے جو کیا تھا وہ کالج کی نائٹ شفٹ میں داخلہ لیا تھا۔ گاوں کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے پور بوائز فنڈ کے بارے میں سنا تھا اس لئے داخلہ لینے کے ساتھ ساتھ اس کے لئے بھی درخواست دے دی تھی۔ نہ کھانے کے لئے پیسے تھے اور نہ ہی رہنے کا ٹھکانہ تھا۔ خالی پیٹ نہ تو علم حاصل ہو سکتا تھا اور نہ ہی محنت مزدوری سو پیٹ بھرنے کے لئے کام کرنا بھی ضروری تھا۔

وہ کہتے ہیں نا کہ شہر میں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔شہر نے اس کا بانہیں پھیلا کر استقبال کیا ۔شہر کی دوڑتی بھاگتی زندگی نے اسے بھی اپنی پناہ میں لے لیا۔

ایک درزی کے یہاں کام مل گیا تھا۔ پہلے تو چائے پانی لانے کا کام کرنا پڑتا تھا پھر وہ بھی سلائی مشین پر بیٹھنے لگا۔کام میں تیزی تو نہیں تھی پر رہنے کھانے بھر کا خرچہ نکل آتا تھا۔ پور بوائز فنڈ بھی منظور ہوگیا تھا تھوڑا بہت بچا کر گھر بھی بھیجنے لگا تھا شہر نے اپنا وعدہ نبھایا تھا ۔رہنے کا ٹھکانہ بھی مل گیا تھا۔بس زندگی کی جدوجہد میں شہر کی رفتار میں وہ شاید زندگی کا حسن یعنی سکون کھو رہا تھا۔ پڑھنے اور کمانے کے چکر میں بہت کچھ پیچھے چھوٹ رہا تھا۔دن بھر کمر توڑ کر سلائی کرتا۔شام کو پڑھنے جاتا ۔اور رات جب بستر پہ جاتا تو صبح ہی آنکھ کھلتی۔ایک مشین کی طرح زندگی گزرنے لگی تھی۔

سمیع چار مہینے بعد گاوں واپس آیا تھا۔ماں اور بہنیں اسے دیکھ کر رونے لگیں۔ پہلے سے کمزور ہوگیا تھا۔محنت اچھے خاصے خوبرو جوانوں کے پسینے نکلوا لیتی ہے پھر سمیع تو پہلے ہی سے فاقہ کشی جھیل کر شہر آیا تھا شہر اسے کیا کمزور کرتا ۔وہ تھا ہی کمزور پر حوصلہ بہت مضبوط تھا۔اور اسی حوصلے کے دم پر ہی وہ مشینی زندگی کو اپنا رہا تھا۔ماں بہنوں کے آنسو پونچھے۔ بھائیوں سے ملا۔باپ سے ملا۔ چار مہینوں کی ساری تھکن چار لمحوں میں اتر گئی۔آج مدتوں بعد گھر میں گوشت پکا تھا۔عید سے پہلے عید کا مزہ آیا تھا۔کھا پی کر سویا تو شام کو ماں کے جگانے پر ہی آنکھ کھلی۔

سمیع تین بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑا تھا ۔گھر میں علی سلمان اور آفرین بیگم کو ملا کر کل سات لوگ تھے ۔علی سلمان کھیتی کرتے تھے ۔اپنا کھیت باغ تھا۔اتنا اناج پیدا کر لیتے تھے کہ گھر کے لئے رکھنے کے بعد اچھا خاصا اناج بیچ دیا کرتے تھے۔جس سے گھر کے دوسرے اخراجات پورے ہوجاتے تھے۔ پیسے جوڑ جوڑ کر پکا مکان بھی کرلیا تھا۔گھر پکا کرانے میں کچھ قرضہ بھی چڑھ گیا تھا وہ بھی دھیرے دھیرے ادا کر رہے تھے۔ پر قحط نے سب برباد کر دیا۔کمر توڑ کر گھر پر بیٹھا دیا۔ پہلے گھر کا اناج ختم ہوا۔پھر قرض کے بوجھ نے دبایا۔سب کے کھیت خالی تھے۔محنت مزدوری کرنا بھی چاہیں تو کہاں جائیں گاوں تو گاوں پورے علاقے کا وہی حال تھا۔

سمیع سو کر اٹھا تو گاوں میں نکل گیا۔اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے جس جگہ انسان کا بچپن گزرا ہو جن گلیوں میں وہ کھیلا کودا ہو اس جگہ سے انسان کو بے حد محبت ہوتی ہے۔سمیع اپنے سوکھے کھیتوں پر گیا بہت دیر تک اپنے کھیتوں کو دیکھتا رہا ۔خوشحال لمحوں کو یاد کرتا رہا۔اس نے اپنے سوکھے ہوئے کھیتوں کو اس طرح دیکھا جیسے سوکھے ہوئے کھیت اسے اپنی کہانی سنا رہے ہوں ۔اس دن سمیع پورے گاوں میں گھوما اپنے سب دوستوں سے ملا گاوں میں سب ویسا ہی تھا۔آخر چار مہینوں میں بدلتا ہی کیا۔ہاں اگر پانی برسا ہوتا تو ضرور مٹی میں نمی آئی ہوتی۔اس کے پاس کل چار روز کی چھٹی تھی ایک دن تو آنے جانے میں ہی لگ گیا باقی کے تین دن بھی گزر گئے۔آخر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے واپس شہر جانا تھا۔قرض جو چکانا تھا ماں باپ کی محبت کا بھی اور مہاجن کا بھی۔جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ شہر لوٹ آیا دو چار دن تو شہر میں دل نہیں لگا۔رہ رہ کے اسے گھر کی یاد ستاتی رہی۔ پر کب تک وہ گھر کو یاد کر کے اداس رہتا۔آخر گھر والوں کے لئے ہی تو گھر کو چھوڑا تھا۔دل لگے یا نہ لگے مجبوری سب کرا لیتی ہے۔

سمیع پھر سے شہر کی مشینی زندگی میں رنگ گیا تھا سارا دن سلائی اور شام میں کالج جاتا۔تھک ہار کر سوتا تو سویرے ہی آنکھ کھلتی۔جب سے گاوں سے واپس آیا تھا تو پہلے سے زیادہ کام کرنے لگا تھا۔وقت سے پہلے ذمہ داری کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا۔ پڑھائی سے زیادہ دل سلائی میں لگتا تھا۔آخر سلائی اس کی ضرورت جو پورا کرتی تھی۔پچھلے چار مہینوں میں اچھا خاصا کام سیکھ گیا تھا۔دل لگا کر کام کرتا۔گھر صرف خرچ کے لئے ہی پیسے نہیں بھیجتا بلکہ کچھ رقم قرض ادا کرنے کے لئے بھی بھیجنی شروع کر دی تھی۔قرض کے ادا ہوجانے سے ماں باپ کے بوجھ کم ہوجاتا اور شاید وہ سکون کی سانس لیتے کہ انہیں کم سے کم ایک جگہ سے تو فراغت ملی۔

سمیع جن کھانے کے لیے ہوٹل کی طرف جاتا تو ایک سے ایک کھانے کی خوشبوئیں اسے اپنی جانب کھینچتی ۔کباب پراٹھے ،بریانی ،قورمہ،تندوری مرغ دل ان کھانوں کی طرف کھینچتا پر جیب اور ذمہ داری اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔کبھی کبھی زبان کے ساتھ ساتھ اس خوشبودار کھانوں کی طرف چل پڑتے تھے پر جیسے ہی قریب پہنچتا اس کو گھر کے حالات یاد آجاتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی قدم لوٹ چلنے کو مجبور ہوجاتے۔نہ جانے ذمہ داری کی یہ کون سی منزل تھی جسے جسم کا ہر ایک عضو بخوبی نبھانے کے لئے تیار تھا۔قدم خود بخود سائی بھوجنالیہ کی جانب چل پڑتے۔شاکاہاری ہوٹل تھا برسوں سے پتائی نہ ہونے کی وجہ سے درودیوار سفید سے کالے ہو چکے تھے چار میزیں ایک کے بعد ایک لائن سے لگی ہوئیں تھیں۔ان کے اردگرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں دیوار سے لگی ہوئی لکڑی کی دو بڑی بڑی بینچز پڑی ہوئی تھیں۔کل ملا کر ایک ساتھ تیس لوگ کھانا کھا سکتے تھے۔تیس روپے والی تھالی کا آرڈر دے کر پیچھے والی تھالی پر بیٹھ گیا۔تھالیوں کے بھی کئی دام تھے۔سب سے اچھی تھالی سو روپے کی تھی اور سب سے سستی تھالی تیس روپے کی تھی۔سو روپے والی تھالی میں گلاب جامن ،پنیر،چھولے،گھی لگی روٹی،تڑکے سے تر بتر دال مکھنی ،اچار،سلاد سب ملتا تھا۔جبکہ تیس روپے والی تھالی میں بنا گھی کی دال جو کہ صرف ایک ہی بار ملتی تھی۔سبزی ترکاری کے نام پر چار ٹکڑے آلو کے،تین روٹی اور تھوڑا سا چاول،دو پھانک پیاز کے اور ایک ہری مرچ۔تیس روپے میں اور کیا ملتا۔

وہ چاہتا تو پچاس والی تھالی کھا سکتا اور ایک

ترکاری اور دو زائد روٹیوں کے لئے وہ بیس روپئے زیادہ کیونکر خرچ کرے۔ جب پیٹ تیس والی تھالی میں ہی بھر جاتا تھا۔ دو ٹائم کھاتا تھا۔ اس طرح روز کے چالیس روپئے زائد جاتے۔ مہینے میں یہ رقم بارہ سو روپئے پہنچ جاتی۔ بارہ وس روپئے وہ گھر بھیج دے گا تو اماں کو راحت ہو جائے گی۔ ان پیسوں سے تو اماں مہینے بھر کی ترکاری کا جگاڑ کر لیتی۔ اگر میں اپنی تھالی سے ایک ترکاری کم لوں گا تو میرے پورے گھر کو مہینے بھر ترکاری مل جائے گی پھر میں بھی تو آلو کی ترکاری کھاتا ہوں گھر پر تو قحط کے بعد فاقہ کرنا پڑتا۔ دھیرے دھیرے ہی سہی شہر نے اسے بہت کچھ دیا سر چھپانے کو چھت دی روٹی دی جیسے جیسے وہ کام سیکھتا جا رہا تھا اس کی تنخواہ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب تک دکان پر چائے پانی لاتا تھا ساٹھ روپئے روز کا ملتا تھا۔ پھر جب ترپائی کا کام کرنے لگا تو سو روپئے روز کے ملتے تھے اور جب سے مشین پر بیٹھنے لگا ہے ایک سو اسی روپئے روز کے ملتے ہیں۔

بیتے دس سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وہ جب شہر میں آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا، نہ کھانے کے پیسے، نہ رہنے کا ٹھکانہ، بیچارہ بے بس، حالات کا مارا تھا۔ کچھ لوگوں نے، مدد کی کچھ خود محنت کی اور آج اس نے خود کی سلائی کی دکان کھول لی۔ اب وہ تنخواہ لینے والوں کی لائن میں نہیں لگتا تھا بلکہ تنخواہ دینے والی کرسی پہ بیٹھا کرتا تھا۔ گریجویشن پورا کرنے کے بعد اس نے پڑھائی کو الوداع کہہ دیا تھا کیونکہ بے روزگاروں کی اس لمبی کھیپ میں وہ خود کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ خود کا مالک بن کے رہنا چاہتا تھا اور اپنی محنت اور حوصلے کے بل بوتے اپنا مالک آپ بن بھی گیا۔

گاوں میں بھی اب بہت کچھ بدل گیا تھا کھیتی باڑی، پٹری پہ آ چکی تھی پر پانی نہ برسنے پر وہی ہاہا کار مچتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں سرکاری ہینڈ پائپ سے اب بھی بالو ہی نکلتا تھا۔ گھر پر بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ قرض ادا ہو گیا تھا کھیتی کا کام چل رہا تھا۔ بھائی بہن سب پڑھائی کر رہے تھے۔ بہنوں کی تو شادی بھی پکی ہو چکی تھی۔ آنے والی عید کے بعد وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔ بھائی بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیت میں ابا کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ سمیع نے دونوں بھائیوں سے کہا تھا کہ وہ محنت سے پڑھائی کریں۔ انہیں اور کسی چیز کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اماں نے اس کے لئے بھی لڑکی ڈھونڈنی شروع کر دی تھی۔ بہنوں کے ساتھ اس کی بھی شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ بھی اس امید سے کہ بہو گھر آ جائے گی تو بیٹا گھر کے زیادہ چکر لگائے گا۔ پر وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ یہیں شہر میں بس جانے کا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ گاوں جانا نہیں چاہتا تھا یا وہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ یا پھر شہر کی رنگینیوں نے اسے اپنا شیدا بنا لیا تھا۔ شہر کی مشینی زندگی اس کی مجبوری ضرور تھی پر محبت ہرگز نہیں۔

وہ جب بھی گاوں جاتا تھا گھر والوں سے ملاقات کرنے کے بعد پورے گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ اپنے کھیتوں پر جاتا تھا۔ کیا اپنے کیا پرائے سب سے ملتا سب سے باتیں کرتا۔ اپنے گاوں سے اسے بے انتہا محبت تھی پر وہ شہر سے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ دو چار دن کے لئے تو آ سکتا تھا پر ہمیشہ کے لئے نہیں کیونکہ شہر نے زندگی کے سب سے مشکل دور میں اس پہ احسان کر کے اسے اپنا قیدی بنا لیا تھا یہ قید کسی زنجیر کی نہیں بلکہ روٹیوں کی تھی۔ یہ ایک ایسا قرض تھا جسے وہ چاہ کر بھی اتار نہیں سکتا تھا۔ شہر میں اس کا کام جم چکا تھا۔ اچھے پیسے کما رہا تھا۔ گاؤں کے مسائل آج بھی تمام تبدیلیوں کے بعد جس کے تس تھے۔ کھیتی آج بھی موسم کی مہربانی کے سہارے ہوتی تھی۔ موسم اگر مہربان تو فصل اچھی ورنہ پھر وہی ٹھن ٹھن گوپال والی بات۔ اس نے فاقوں کی تکلیف کو جھیلا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ یا اس کے گھر والے وہی برے دن پھر سے جھیلیں۔ کئی بار ارادہ کیا تھا گاؤں لوٹ جانے کا پر جب ارادہ کرتا فاقوں کی بے چینی اور روٹیوں کے لئے تڑپ کو یاد کر کے سہر اٹھتا۔ قید زنجیر کی ہوتو اسے ایک بار توڑا بھی جا سکتا ہے پر روٹیوں کی ملائم قید سے آزادی تو سانسوں کے تھم جانے پر ہی میسر آتی ہے۔

□□□

نہ جانے کیا تھا کل نیر کہ بزمِ جام و مینا میں
ہوئی محسوس ساقی کو ہماری ہی کمی تنہا

مدیر ماہنامہ 'شمع ادب' معروف شاعر، معتبر و مستند صحافی، سید توکل حسین نیر سلطانپوری، جن کی شاعری تصوف، احتجاج وانقلاب کی ایک موثر ترین آواز ہے، اور ان کی ادبی صحافت اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ 'نیا دور' بہت جلد نیر سلطانپوری کی مجموعی ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جا رہا ہے۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

غزل

ہر راستہ نیا مری خاطر بنا دیا
مجھ کو ضرورتوں نے مسافر بنا دیا

ہجرت تو میں نے کی تھی مگر میری نسل کو
ہجرت کئے بغیر مہاجر بنا دیا

شعروں میں میرے کس نے طلسمات بھر دئے
لوگوں نے سن کے مجھ کو بھی ساحر بنا دیا

اس زندگی نے خوب کیا اے شب فراق
تجھ کو مری غزل مجھے شاعر بنا دیا

لکھا تھا جس نے دل کے ورق پر مجھے کبھی
میں مٹ چکا تھا اس نے مجھے پھر بنا دیا

جب جھوٹ نے ستایا تو آئینوں نے مجھے
سچائیوں کے ذکر کا ذاکر بنا دیا

اس دور میں ہوس کی یہ معراج ہے نظیرؔ
انساں کو جس نے لاشوں کا تاجر بنا دیا

نظیرؔ باقری
اکروٹیہ سادات، اسمولی، سنبھل
موبائل: 9411430542

غزل

روٹھے ہو منا لیں گے روتے ہو ہنسا لیں گے
تم غیر بنو لیکن ہم اپنا بنالیں گے

شرمائی ہوئی نظریں اور الجھی ہوئی زلفیں
گھبرائے ہوئے شکوے ہم سب کو چھپالیں گے

آجاؤ تخیل میں، آجاؤ تصور میں
ہم شمع کے بدلے میں دل اپنا جلالیں گے

الفت کی جگہ نفرت، عزت کی جگہ ذلت
کچھ سلسلہ رہ جائے یہ غم بھی اٹھا لیں گے

مینا ہے نہ میخانہ، ساغر ہے نہ پیمانہ
انداز ہے مستانہ نظروں سے پلالیں گے

تسکین محبت میں منزل ہے قیامت کی
جاں لینا نہیں سیکھا جاں دے کے بچالیں گے

جس طرح ضمیرؔ ان تک ممکن ہو پہنچ جاؤ
اجڑی ہوئی دنیا کو ہم ان سے بچا لیں گے

ضمیرؔ سیدپوری
سیدپور، سلطانپور
موبائل: 9415961899

غزل

دل کے زخموں کو زمانے سے چھپانے کے لئے
ہنسنا پڑتا ہے یہاں سب کو دکھانے کے لئے

کب سے بیٹھے ہیں مری آنکھ کی انگنائی میں
خواب بچوں کی طرح شور مچانے کے لئے

اپنے دیدار کا شربت تو پلا دے ہم کو
ہم تو آئے ہیں ترے شہر سے جانے کے لئے

میرے اشعار ہی دولت، یہ خزانہ ہے میرا
ڈھونڈتا رہتا ہوں کچھ سانپ خزانے کے لئے

روندنے کے لئے تیار ہیں سارے اپنے
کوئی راضی ہی نہیں مجھ کو اٹھانے کے لئے

تجربے اپنے کہاں تک لکھیں راہیؔ ہم بھی
اب تو مصرع بھی نہیں کوئی اٹھانے کے لئے

ڈاکٹر راکیش راہیؔ
C-84، سیکٹر بی، علی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9415334449

غزل

کوئی راہِ راست پر کیونکر چلے
رہزنوں کی چال جب رہبر چلے

دامن الجھے گا گلستاں میں ضرور
لاکھ کانٹوں سے کوئی بچ کر چلے

دل کے وہ ایسے ہیں اک راس و رئیس
نذر میں جن کی بہت سے سر چلے

وہ بلند اختر ہے مہوش اس قدر
دیکھنے جس کو مہ و اختر چلے

جب کبھی اٹھی نگاہِ التفات
سیکڑوں ناوک مرے دل پر چلے

آپ کی محفل میں آئے خالی ہاتھ
اور اشکِ خوں سے دامن بھر چلے

سیمبر کے لعل و لب پر اے اسیفؔ
صدقہ ہونے پھر زر و گوہر چلے

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی
نورِ ہدایت فاؤنڈیشن، امامباڑہ غفران مآب، چوک، لکھنؤ
موبائل: 8736009814

لکھنؤ کا چکن اور کامدانی

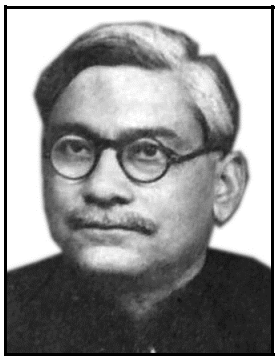

مرزا جعفر حسین

معروف ادیب و مورخ
شاہان اودھ کے لکھنؤ کی
تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور
زوال پذیر تاریخ کے مستند مورخ
پیدائش: ۱۸۹۹ء
وفات: ۱۹۸۹ء

چکن شہر لکھنؤ کی وہ قدیم ترین صنعت کاری ہے جو دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہی نہیں رہی بلکہ ہر اعتبار سے برابر ترقی کرتی گئی ہے اور اس کی شہرت اب ملک کے باہر دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ جن ملکوں میں گرمی کے موسم اور اس موسم کے ہلکے کپڑوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا وہاں بھی چکن کے کپڑوں کو پسند کیا جاتا اور خریدا جاتا ہے۔ ابتدا میں اس صنعت گری کو اس شہری کے خواص و عوام کی سرپرستی حاصل تھی۔ انہیں کی قدردانیوں نے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ زمانہ ارزانی کا تھا۔ ڈیڑھ دو روپیہ میں چکن کا کرتا مل جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں بھی یہی نرخ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی میں اور بھی سستا کرتا ملتا ہو۔ بہرحال اس فن کی نزاکت اور نفاست کی بدولت چکن کے ملبوسات بہت پسند کئے جاتے تھے اور ارزانی کے باعث کم حیثیت شرفاء و عوام بھی ان کے دلدادہ تھے۔ رفتہ رفتہ گرانی کا زمانہ آیا تب بھی چکن کی ہر دلعزیزی میں فرق نہیں آیا کیونکہ اس کے قدردانوں کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اب تجارتی نقطۂ نظر سے اس فنکاری کو سرکار کی سرپرستی حاصل ہے اور یہاں کے مصنوعات دور دور فروخت ہوتے ہیں۔

چکن کے نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ساٹھ ستر برس قبل تک متعدد دلچسپ روایات مشہور تھیں جن کی افسانوی حیثیت سے زیادہ کوئی وقعت نہیں تھی۔ اسی طرح اس کی تخلیق کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جاتا تھا لیکن قرین قیاس یہی قول ہے کہ جامدانی کو دیکھ کر چکن کا تخیل اجاگر ہوا تھا۔ قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد جامدانی کا معدن تھا۔ وہاں سے بہترین جامدانی کے تھان اچھی سے اچھی وضع قطع کے بن کر آتے تھے۔ روسا و عمائدین اور خوشحال شرفاء ان کی اچکنیں اور انگھرکھے بنواتے تھے۔ ایک تھان میں ایک اچکن یا ایک انگرکھا تیار ہوجاتا تھا۔ باوجود ارزانی کے جامدانی کے تھان عوام کی دسترس سے باہر تھے لیکن ہر خاص و عام کے لئے جاذب نظر ہوتے تھے۔ لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں امیر و غریب سب ہی کو مطمئن اور آسودہ رکھنے کا جوہر ہمیشہ موجود رہا تھا۔ اسی عنصر نے فنکاروں میں چکن کا تخیل اجاگر کیا اور تنزیب پر ایسی ایسی گل کاریاں عمل میں آگئیں جن کو دیکھ اور پہن کر رئیس و غریب سب ہی خوش ہوگئے۔ جامدانی کا کپڑا مع اپنی صنعت کاریوں کے انتہائی نرم و نازک اور باریک و مہین دھاگے سے تیار ہوتا تھا۔ یہ دھاگا ولایت سے آتا تھا۔

اس کا آنا بند ہو گیا تو جامدانی کی صنعت اس طرح ختم ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر بھی غالباً اب جامدانی کا تھان نہیں ملے گا لیکن چکن بنانے کا دھاگا پہلے بھی اسی ملک میں تیار ہوسکتا تھا اور اب بھی تیار ہوتا ہے البتہ پہلے وہ بھی ولایت سے آتا تھا اور سستا تھا۔ اب دیسی دھاگا مقابلتاً بہت گراں ہے۔

دوسری خصوصیت چکن کی یہ ہے کہ یہ کام تنزیب پر بنایا جاتا ہے۔ چکن ساز کو کپڑا تیار کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ اس کو سلا ہوا کپڑا فراہم کر دیا جاتا ہے یا وہ خود ایسے کپڑے خرید کر چکن کا کم تیار کرتا ہے۔ پرانے زمانہ میں تنزیب بھی بہت باریک آتی تھی۔ ویسی تنزیب اب کہیں دکھائی نہیں دیتی لیکن چکن کے کام نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ موٹی تنزیب تو درکنار مقابلتاً دبیز کپڑوں مثلاً ارگنڈی وغیرہ پر بھی چکن کا اچھا کام تیار کر لیا جاتا ہے۔

چکن بنانے کا یعنی کاڑھنے کی ایجاد غریب شرفاء کے طبقہ میں ہوئی تھی۔ اس روایت کے ثبوت میں یہی صورت حال کافی ہے کہ عہد قدیم سے یہ کاروبار لکھنؤ کی پرانی آبادی میں ہوتا آیا ہے۔ بہترین چکن بنانے والے کشمیری محلہ بالخصوص متصل درگاہ حضرت عباس، مفتی گنج، احاطہ مرزا علی خاں، حسین آباد اور انہیں محلوں کے قرب و جوار یعنی محمود نگر وغیرہ میں پیدا ہوئے تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ بعض خاندانوں میں یہ کام سو برس بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے مسلسل جاری ہے۔ مثلاً عہد واجد علی شاہ میں ایک بزرگ میاں جی بہت بلند پایہ چکن ساز تھے۔

ان کے خاندان میں ذاکر حسین اور کاظم حسین کے ایسے ہنرمند پیدا ہوئے تھے، کاظم حسین شاعر بھی تھے اور گردوں تخلص کرتے تھے۔ انہیں کے عزیزوں میں امیر حسین چکن ساز بھی تھے جو بہت مشہور صناع تھے، یہ کاروبار اس خاندان میں اب تک جاری ہے۔ محلہ مفتی گنج میں پتن صاحب، شمشاد صاحب اور دولہا صاحب مرحوم بڑے

> 'نہ روم، نہ ایتھنس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'
>
> ۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔
>
> پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔
>
> **'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'**
>
> اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی گیارہویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **گزشتہ لکھنؤ کی آخری بہار** سے ایک تحریر **'سود و زیاں کی کشمکش میں جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔
>
> **(ایڈیٹر)**

ہنرمند فنکار تھے اور آج بھی بابو صاحب کا شمار بہترین کاریگروں میں ہے۔

کشمیری محلہ کی قربت میں محمود نگر واقع ہے۔ یہاں بھی چکن بنانے کا کام رائج ہو گیا تھا۔ اس محلہ میں شمشاد علی خاں اور ان کے بعد محمد عثمان بڑی شہرت کے مالک ہوئے تھے۔ لیکن یہ تمام مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں کیونکہ اصل صناعی ہمیشہ پردوں میں رہنے والی مستورات کے ہاتھ میں رہی ہے اور اب بھی ہے۔ چکن سازی حقیقتاً صنف نازک ہی کا کام ہے کیونکہ یہ ایک لطیف و نازک صنعت ہے جس کو عورتوں ہی سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کو اجرت بھی کم دینا پڑتی ہے اور اب بھی کم دینا پڑتی ہے۔ اس لئے کاروباری لوگ یہ کام زیادہ تر عورتوں سے کرواتے ہیں۔ ابتدا میں چکن سازی کم حیثیت شرفائے لکھنؤ کے لئے حصول معاش میں بھی ایک گراں قدر وسیلہ تھی۔

چکن سازی جب معرض وجود میں آئی تھی تو چکن سازوں کے سامنے صرف جامدانی کی وضعوں کے نمونے تھے جن میں بعض کا مقابلتاً موٹے کپڑے پر موٹے دھاگے سے نقل کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے نئی نئی وضعوں کا ایجاد کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس ضرورت کی فراہمی رؤسا و عمائدین خود اپنی پسند سے یا اپنے مصاحبین و مقربین کے مشوروں سے کیا کرتے تھے اور انہیں کی مرضی کے مطابق چکن ساز کام بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ اس طرح بہت سی شکلیں اور طرزیں معرض وجود میں آ گئی تھیں۔

رفتہ رفتہ ایک طبقہ آرٹسٹ کا پیدا ہو گیا تھا جنہوں نے وضعیں اور طرزیں بنا بنا کر چکن سازوں کو فراہم کی تھیں۔ اب رؤسا و عمائدین باقی نہیں رہے اور نہ ان کے مزاج داں باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے چکن سازی کا سارا کاروبار آرٹ بنانے والوں ہی کے تیار کردہ طرزوں پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی فرمائشیں بھی ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر نمونے آرٹسٹ ہی تیار کرتے ہیں۔

اس فرمائشی چکن سازی کے علاوہ کثرت

کار پہلے بھی بازاری تھی اور اب بھی ہے۔ اس بازاری چکن سازی میں چکن سازوں کو خریداروں کے ذوق اور ان کی مالی حالت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ساٹھ ستر برس قبل بازار میں فروخت ہونے والے کرتوں میں بہتات سے کام بنا ہوتا تھا۔ سامنے ایک بڑا چوڑا ہار، آستینوں کے مونڈھوں پر جالی دار کٹاؤ ضرور ہوتا تھا۔ بہت سے کرتوں میں آگے کے دامن پر دونوں جانب پھول یا کیریاں بنی رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ شوق گھٹا یا گرانی نے گھٹایا اور اب ایک معیاری چکن کے کرتے میں آستینوں کے مونڈھوں اور آگے کے چاک کے دونوں جانب چکن کا کام بنا ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ ہار پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ انتہائی دیدہ زیب اور نفیس گلوبند بھی ختم ہو گیا جو پرانے زمانے میں کرتوں کے گلوں پر بنا ہوتا تھا۔

چکن کا کام ملبوسات کے علاوہ متفرق ساز و سامان آرائش پر بھی بنوایا جاتا تھا۔ ملبوسات یں مردوں کی ٹوپیاں، کرتے اور اچکنیں اس کام کے لئے مخصوص تھے۔ راقم نے کبھی کوئی چکن کا انگرکھا کسی رئیس کو پہنے نہیں دیکھا۔ اس کے لئے جامدانی ہی مخصوص تھی۔ عورتیں چکن کا کام شلوکوں ہی پر بنواتی تھیں۔ چکن کے کام کے دوپٹے شاید ہی کہیں اور کبھی اوڑھے گئے ہوں لیکن جب شادیوں میں پہننے کا رواج ہوا تو اس لباس میں اب تک بے شمار ایجادات واختراعات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

اس کثرت کار کی بدولت چکن سازی کے طرز میں بھی سہولتیں فراہم کر لی گئی ہیں۔ ابتداء میں جو نمونے چکن سازوں کو دئے جاتے تھے، ان کے لکڑی پر بلاک تیار کرائے جاتے تھے جن کو سانچہ کہتے تھے اور ان کے چرنوں کو کپڑے پر اتار کر چکن سازی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ فنکاری بڑھی تو نمونے کاغذ پر تیار ہونے لگے اور اس کاغذ کو ملبوس پر رکھ کر البیوں سے چھید کر کے اور تیار کردہ مسالہ مل کر پورا نقشہ کپڑوں پر چھان کر اتارا جانے لگا اور اسی نقشہ پر چکن کا کام بنایا جانے لگا تھا۔ کم و بیش یہی طرز اب بھی رائج ہے۔ نمونوں کے مطابق چکن سازی کا کام بھی مختلف اور متعدد طرزوں سے ہوتا ہے۔ ہر شکل اور ہر طرز کا علٰیحدہ علٰیحدہ نام بھی تھا۔ بہت پرانی طرزوں میں جواب تک رائج ہیں۔ بخیہ، الٹی بخیہ، جالی، صرّی، ہتکٹی، ست خانی، پھندا کے نام قابل ذکر ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ جدید مذاق نے اور بہت سی طرزوں کو جنم دیا ہوگا جن کے نام اس لئے نہیں ہیں کہ نام رکھنے کا ذوق باقی نہیں رہا۔

چکن کے ذیل میں کامدانی کا ذکر آتا ہے۔ کامدانی زردوزی سے بھی قریب ہے لیکن طرزِ صنعت گری کے لحاظ سے اس کو چکن سے زیادہ قربت ہے۔ کامدانی کو روٗسا و عمائدین کے یہاں مقیش کہتے تھے کیونکہ اس میں روپہلی اور سنہری بہاریں ہوتی تھیں۔ صنعت گروں کی زبان پر لفظ بادلہ رائج تھا۔ بادلہ کے معنی تھے تار، خواہ وہ چاندی کا ہو یا چاندی پر سونا چڑھا ہو۔ کامدانی کا کام انہیں تاروں سے بنتا تھا۔ اس لئے اس کو بھی بادلہ کہتے تھے۔ سونے کے تار نرم و نازک ہونے کی وجہ سے کارآمد نہیں ہوتے اس لئے چاندی کے سونا چڑھے ہوئے تاروں کو سونے کے تار کہا کرتے تھے اور عند الضرورت انہیں سے کام بنواتے تھے۔ مردانے ملبوسات میں ٹوپیوں اور کرتوں پر کامدانی بنا کرتی تھی اور عورتیں کامدانی کے شلوکے اور دوپٹے استعمال کرتی تھیں۔

اصل کامدانی وہی تھی جس میں کپڑوں پر روپہلی یا سنہری بندکیاں دور دور ڈال دی جاتی تھیں۔ ان بندیوں کو دانہ رفدی کہا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان بندکیوں کے ڈالنے میں وضعیں اور قطعیں ایجاد کر لی گئی تھیں۔ ہر مخصوص وضع میں بندکیاں اس طرح ڈالی جاتی تھیں کہ کوئی خاص شکل یا شباہت رونما ہو جائے۔ ان وضعوں میں ہر ایک علٰیحدہ علٰیحدہ نام کرھ لئے گئے تھے۔ بعض ناموں کی مناسبت شکل و شباہت سے تھی لیکن بعض نام شاعرانہ انداز میں رکھ لئے گئے تھے۔ چند وضعیں جو ساٹھ ستر برس قبل بہت مرغوب تھیں۔ سلیمی، بادلی، اوریہ، پٹ، ستخانی، کرن (منڈا کرن، چٹپا کرن)، سات میل رنگ، چاند، ناخونی وغیرہ وغیرہ کہلاتی تھیں۔ بعض وضعوں میں کچا اور پکا دونوں کا طرح کا کام ہوتا تھا۔

ساری کے رائج ہونے کے بعد کامدانی کے کام میں بہت اضافہ ہو گیا۔ کرتوں اور دوپٹوں کے مقابلہ میں ساری کے کناروں نیز متن میں نئی نئی وضعیں نکال دینا مقابلتاً آسان تھا۔ اس لئے ساریوں میں طرح طرح سے کامدانی بنی اور اب بھی بنتی ہے لیکن پرانے زمانے میں صفائی اور سادگی کا جو مذاق تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اب بندکیاں عموماً سستے قسم کے تاروں سے ڈالی جاتی ہیں اور پرانے زمانے میں جو پکا کام ہوتا تھا وہ گرانی کے سبب سے بہت کم ہو گیا ہے۔ پھر بھی کامدانی کی ساریاں بہت دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ چکن بنانے والے کامدانی کا کام بھی کرتے ہیں۔

ان صنعت گروں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں بندکیاں جلد ڈال لیتی ہیں اور ان کی اجرت بھی کم ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں مردوں میں کامدانی بنا ہوا لباس بہت مرغوب تھا لیکن اب بہت کم ہو گیا ہے۔ کم سے کم کامدانی کی ٹوپی کسی کے سر پر نظر نہیں آتی اور کامدانی کا کرتا پہننے والے بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ صنعت گری صنف نازک کی منظور نظر ہے پھر بھی چکن کی طرح اس کی تجارت بیرونی مما لک میں ہوتی ہے۔

□□□

انیس اشفاق کے ناول 'خواب سراب' کا بیانیہ

سفینہ بیگم

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ، وارانسی
رابطہ: 8171986935

اردو ناول کی تاریخ میں نذیر احمد سے لے کر موجودہ دور تک متعدد ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جو اپنے اسلوب بیان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ناول کی قرأت میں دلچسپی کو برقرار رکھنا اس کے طرز بیان سے منسلک ہوتا ہے۔ موضوع خواہ کوئی بھی ہو اس کو بیان کرنے کے منفرد انداز پر ہی بیانیہ کا انحصار ہوتا ہے جو پلاٹ کے ذریعہ کہانی کو ایک سمت عطا کرتا ہے۔ بیان کا تعلق بیان کرنے والے سے ہوتا ہے جو اس قصہ کو سنا رہا ہوتا ہے جسے فکشن کی اصطلاح میں راوی/ بیان کنندہ کہتے ہیں۔ ناول کے کینوس پر راوی کی حیثیت ایک لفظی ماہر بناض کی سی ہوتی ہے جو ناول سے باہر حقیقی دنیا میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا لیکن ناول میں ہونے والے واقعات وحادثات سے وہ بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ راوی کی سوچ، اس کا قوت مشاہدہ، اس کا طرز عمل اور نقطہ نظر ہی ناول کی فکری سطح متعین کرتا ہے کیونکہ ناول میں موجود تمام کرداروں کی پیش کش کا انحصار راوی کی ذات سے جڑا ہوتا ہے اور راوی کا بیان ہی قصہ کے داخلی رموز ونکات میں ربط کا کام انجام دیتا ہے۔ راوی دو طرح کے ہوتے ہیں واحد غائب جسے ہمہ بیں راوی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور دوسرا واحد متکلم۔ اول الذکر راوی ''وہ'' کے توسط سے ناول کے واقعات سے متعلق تمام باتوں کو بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے خواہ وہ کردار کے ذہن ودل میں موجود کوئی خیال ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ناول کے واقعات میں خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے اپنی شمولیت قائم رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی منظر یا صورت حال کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کردار کی اندرونی احوال وکوائف تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ جبکہ موخر الذکر راوی کی ترجیحات اس کے مقابلے میں محدود ہوتی ہیں یہ قصہ کو بیان کرنے میں محتاط ہوتا ہے۔ واحد متکلم راوی وہی کچھ بیان کرسکتا ہے جو اس کے مشاہدہ میں آیا ہو یا پھر اس نے کسی سے اس کے متعلق سنا ہو۔ وہ کسی کردار کی دلی کیفیات کا بیان نہیں کرسکتا۔ واحد متکلم راوی کو دو طرح سے تشکیل دیا جاتا ہے پہلا یہ کہ یا تو وہ واقعات کا محض شاہد یا ناظر ہو جو ''میں'' کی وساطت سے کسی دوسرے کردار کے بارے میں بیان کررہا ہو یا دوسرا یہ کہ راوی ''میں'' بحیثیت کردار واقعات میں شامل ہو جس میں ناول کا قصہ اس کی حالات زندگی پر مبنی ہو۔ یہاں اس بات کا ذکر کردینا ضروری ہے کہ بیانیہ اپنے راوی کی ترجیحات اس کی ذات وصفات اور نقطہ نظر کا پابند ہوتا ہے۔ ماریو برگس یوسا نوجوان ناول نگار کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''راوی ہمیشہ ایک ساختہ کردار ہوتا ہے۔ایک فکشنی وجود، بالکل ان تمام دوسرے کرداروں کی طرح جن کی کہانیاں ''بیان'' کرتا ہے،تاہم یہ سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے کیوں کہ اس کا طرزِعمل،اپنے کو ظاہر کرنا یا چھپانا،لٹکائے رکھنا یا تیزی سے آگے بڑھ جانا،عیاں کرنا یا گریز، باتونی ہونا یا کم آمیز،چنچل ہونا یا سنجیدہ،ہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ دوسرے کرداروں کی حقیقت کا قائل ہوگا یا نہیں اور ہم بھی اس کے قائل ہونگے یا نہیں کہ وہ محض کٹھ پتلیاں یا مضحکہ خیز خاکے نہیں ہیں۔راوی کا طرزِعمل کسی کہانی کا اندرونی ربط قائم کرتا ہے،اور یہ، اپنی باری میں اس کی قوت ترغیب کے تعین کا ایک ضروری عامل ہے۔''(۱)

اردو ناولوں میں واحد متکلم اور واحد غائب دونوں قسم کے بیان کنندہ کے تجربہ کیے جا چکے ہیں جن میں ہمہ داں راوی کے ذریعہ بیانیہ کو تشکیل دینے کا غالب رجحان دیکھنے کو ملتا ہے اور واحد متکلم راوی کے زمرے میں چند ہی ناول نظر آتے ہیں۔ان میں سب سے پہلا ناول ''امراؤ جان ادا'' ہے۔واحد متکلم کے ذریعہ کہانی کو منظم و متشکل کرنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ ہر مقام پر اس بات کا از حد خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات بیان نہ ہو جائے جو واحد متکلم راوی کی دسترس سے دور ہو اور اس کی صفات و خصوصیات کو مجروح کرتی ہو۔واحد متکلم راوی کی ایک بہترین مثال انیس اشفاق کا ناول ''خواب سراب'' بھی ہے۔جس میں ابتدا سے آخر تک بیان کنندہ نے واقعات کو تشکیل دینے میں محض اپنی ذات کو ہی شامل نہیں کیا بلکہ اکثر مقامات پر وہ سامع ،ناظر اور مبصر کی حیثیت سے بھی سامنے آتا ہے۔قصہ میں واحد متکلم راوی ایک محقق کے طور پر سامنے آتا ہے ایسا محقق جس کا اس واقعہ سے ذاتی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے جس کی تلاش و تفتیش میں وہ در بہ در پھرتا ہے۔لیکن اپنے بزرگوں اور جاننے والوں سے رسوا کے تحریر کردہ کسی مسودہ میں امراؤ جان کی اولاد کا ذکر بار بار سننا اور یہ کہ اس مسودہ کو جس میں اس بات کا بیان ہے رسوا نے اپنے کسی صندوق میں رکھ دیا تھا تا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو،راوی کو حقائق کا پتہ لگانے اور اصل قصہ تک پہنچنے کی تحریک دیتے ہیں۔گویا آگے چل کر راوی کے طرزِعمل سے واقعات کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں جو واقعات میں مخصوص اہمیت کی حامل ہیں۔

ناول کے متن کو قدیم لکھنؤ کی تہذیب و تمدن اور وہاں کے معاشرتی احوال کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہے اور اس تہذیب و تمدن کا بیان راوی یا کرداروں کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ناول کا موضوع ہی اس قسم کے بیان کا تقاضا کرتا ہے لہذا اس اعتبار سے ماحول اور معاشرہ سے تعلق کی بنا پر اس سے مخصوص انسلاکات مکالماتی پیرائے اور بیانیہ میں خود بخود شامل ہوتے چلے گئے ہیں۔ ناول کا آغاز اس انداز سے ہوتا ہے جیسے راوی اپنے سامنے بیٹھے کسی شخص کو کہانی سنا رہا ہو ایسی کہانی جس کی گتھی اس نے سلجھائی ہے اور اپنی اس مہم کی روئداد احرف بہ حرف اپنی ڈائری میں محفوظ کر لی ہے۔راوی کا یہ بیان داستانوی طرز اختیار کر لیتا ہے جو قصہ میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔:

''بہت پہلے جب میں بہت چھوٹا تھا اور ماں انگلی پکڑ کر مجھے اپنے ملنے والوں کے یہاں لے جایا کرتی تھی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر دیر تک باتیں کیا کرتی تھی،تب کچھ بڑی بوڑھیوں کی زبانی امراؤ جان کا نام میں نے پہلی بار سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ امراؤ جان کا واقعہ لکھنے کے بعد رسوا نے بہت سے لوگوں کو بتایا تھا کہ انہوں نے وہی لکھا ہے جو دیکھا ہے اور قصے میں جو کچھ بڑھایا ہے وہ قصے کو بڑھانے کے لیے ضروری تھا''(۲)

اگلے صفحہ پر راوی کا یوں بیان کرنا۔؛

''امراؤ جان کی رہائش والے جس علاقے کی بات میں آپ کو بتا رہا ہوں ،انگریزوں کے جاتے جاتے وہ بہت بدل گیا تھا؛''(۳)

درج بالا دونوں اقتباس واحد متکلم راوی کے بیان کردہ ہیں جو امراؤ جان کی بابت گفتگو کا آغاز کر رہا ہے ۔ ناول کا پلاٹ آغاز ،وسط اور انجام کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔راوی کا مقصد ناول کے اس گمشدہ مسودہ کی بازیافت ہے جس میں امراؤ جان کی اولاد کا ذکر ہے اور جسے اصل ناول میں ذکر کے قابل نہیں گردانا گیا۔ناول کا بیانیہ راوی کے ذہن میں آئے اس جملے کے نتائج کے طور پر تشکیل دیا گیا ہے جب وہ کہتا ہے:

''اپنے بڑوں کے بڑوں سے منتقل ہوتی ہوئی یہ بات جب میرے کانوں تک پہنچی اور جب میں اسے سنتے سنتے بڑا ہوا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ معلوم کروں کہ امراؤ جان کی اصل کہانی کیا وہی ہے جس کا مسودہ رسوا نے الگ رکھ دیا تھا۔''(صفحہ ۱۱)

راوی امراؤ جان کی زندگی کے متعلق جاننے کی کوشش اور جستجو میں واقعاتی سلسلے کو آگے بڑھانے میں مرکزی رول ادا کرتا ہے۔ بحیثیت کردار کے راوی ناول میں موجود تو ہے لیکن اس کی ذاتی زندگی سے کسی واقعہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔جب وہ اس مسودہ کی تلاش میں نکلتا ہے تو بہت سے ضمنی کرداروں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جو اس کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے میں معاون ہوتے ہیں گویا وہ داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے بیانیہ میں موجود ہوتا ہے خواہ ایک سامع کی حیثیت سے ہو یا راوی کی حیثیت سے۔ناول کا زمانی عرصہ تقریباً اڑتیس سے چالیس سال کا ہے جس میں راوی کی عمر کا تعین کرنا آسان نہیں کیونکہ ''میں'' کے ذریعہ بیان کیے گئے واقعاتی تسلسل میں راوی کی نشوونما اور پرداخت بھی ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔ناول کی ابتدا میں راوی کم عمر ہے جس کا اندازہ

راوی اور کردار کے درمیان ہونے والی ایک گفتگو سے ہوتا ہے یہاں بات کو براہ راست نہ کہہ کر بالواسطہ طرز اختیار کیا گیا ہے اور اس قسم کا طرز بیان جملوں کی معنیاتی سطح کو مزید وسعت عطا کرتا ہے۔ اقتباس اس طرح ہے؛-

''آپ کی عمر کے لوگوں میں کتابوں سے اتنی دلچسپی میں نے بہت کم دیکھی ہے۔'' پھر کہا: '' میرے پاس پچاس کے اوپر کی عمر کے لوگ آتے ہیں اور اب وہ بھی کبھی کبھی ہی آتے ہیں۔'' (۴)

درج بالا اقتباس کو پڑھ کر قاری اپنے فہم کے مطابق راوی کی عمر کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہاں یا آگے چل کر اس کی متعینہ عمر کہیں درج نہیں کی گئی ہے یا کسی نے اس سے اس کی عمر کے تعلق سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بات کو بیان کرنے کا یہ طریقہ جس میں مخصوص لفظیات اور اشیا کو پوشیدہ رکھا جائے بیانیہ میں ایک سے زائد معنوی امکانات پیدا کرتا ہے۔ نادر آغا نام کا ایک ضمنی کردار جب راوی کو بتاتا ہے کہ اس قصہ (ناول) کے تمام کردار اصلی ہیں تو راوی کے اندر امراؤجان کی اولاد کے زندہ ہونے کی امید بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہاں پر اس قسم کا اشارہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ راوی کو جب اس مسودہ کی تلاش ہے تو ظاہر ہے وہ اس کے حقیقی کردار کی جستجو میں بھی ضرور نکلے گا۔ یہ پیرائے بیان کی ایک اچھی مثال ہے جس میں کسی واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے اس کے متعلق کوئی ایسا نکتہ بیان کر دیا گیا ہے جو آگے چل کر راوی کے طرز عمل کا احاطہ کرتا ہے اور قصہ کے ارتقائی سلسلے میں بھی معاون ہے۔ اقتباس۔؛

''پھر کہا: ابھی آپ ہی بتا رہے تھے۔ مرزا رسو کے سارے کردار اصلی ہیں، اگر انہوں نے امراؤجان کو اولاد والا دکھایا ہے تو ممکن ہے وہ اولاد ابھی زندہ ہو'' '''یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بولے۔ (۵)

بعد از آں راوی کی ملاقات کئی ایسے ضمنی کرداروں سے ہوتی ہے جن کا تعلق بالواسطہ اس قصہ سے ہے جن میں جہاں دار بیگم اور سردار جہاں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی زبانی بیان کردہ واقعات کے پیش نظر راوی کو اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ امراؤجان کی اولاد زندہ ہے۔ قصہ میں طوالت کی غرض سے چھوٹے چھوٹے ضمنی قصوں کے ذریعہ کسی نہ کسی طور پر لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت، بود و باش، خورد و نوش، آرائش و زیبائش، فنون لطیفہ وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے جس میں طوائفوں کی حیثیت اور ان کے طور طریقوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ راوی جس انداز سے واقعات کو سامع یا ناظر کی وساطت سے قلم بند کر رہا ہے اس پر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ قصہ واقعی اور حقیقی ہے اور اس کی تصدیق کے لیے وہ پچھلے قصہ (ناول امراؤجان ادا) میں تصحیح بھی کرواتا جاتا ہے مثال کے طور پر جہاں دار بیگم اسے بتاتی ہیں کہ؛ ''وہ جوان کی کتاب میں نواب سلطان ہیں، وہ دراصل عمو جان (رسوا) ہی ہیں۔'' ۸۴ یا پھر ''مرزا رسوا نے اسے سید حسین کا پھاٹک لکھا ہے جو غلط ہے۔ اصل میں یہ حیدر حسین خاں کا پھاٹک ہے جو انہوں نے سید حسین کے کٹرے میں بنوایا تھا۔'' ص ۶۹ یا پھر ''امراؤ جب لکھنؤ سے فیض علی کے ساتھ نکلیں تو بڑی مصیبتوں سے کانپور پہنچیں۔ مرزا صاحب نے قصہ یہاں تک صحیح لکھا ہے۔ اس کے بعد جیسا ہمارے سننے میں آیا، فیض علی کچھ دن ان کے ساتھ رہ کر انہیں چھوڑ کر چلا گیا امراؤ کانپور میں بہت دن رہنے کے بعد اپنی بیٹی کے ساتھ لکھنؤ چلی آئیں۔'' ص ۱۸۲ اس قسم کے کئی اور اقتباسات ناول میں موجود ہیں۔

ناول میں ''پوچھنے'' اور ''بتانے'' کا عمل پوری شدت سے کارفرما ہے۔ راوی اس قصہ کے متعلق ہر بات جاننے کا خواہشمند ہے اور ساتھ ہی ان کرداروں کے بارے میں بھی سوال کرتا جاتا ہے جو کوٹھے اور گانے بجانے سے وابستہ رہ چکی ہیں (حقیقت میں ان کا تعلق اشرافیہ طبقے سے ہوتا ہے) اس امید پر کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے وسیلہ سے امراؤجان کی اولاد کا کوئی سراغ مل جائے۔ راوی کا یہ تفتیشی عمل قصہ کو تشکیل دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات راوی کا بار بار یہ بیان یا اس قسم کے جملے کہ ''میں نے کہا، پھر انہوں نے بتایا'' قصہ کو گنجلک بنا دیتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ راوی کو قاری کے فہم پر شک ہے۔ ناول کی دلچسپ بات یہ ہے کہ حقیقت کی تلاش میں راوی اور قاری دونوں کا تجسس ایک ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتا نظر آتا ہے دراصل ناول کا موضوع ہی اس قسم کی بیانیہ ساخت کا تقاضا کرتا ہے جس پیرائے میں راوی نے اسے ترتیب دیا ہے۔ جہاں دار بیگم اور سردار بیگم کے بعد راوی کا حکیم احمد رضا اور شہبا نام کے کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے حالانکہ درمیان میں اور بھی کئی کردار موجود ہیں لیکن قصہ کی مخصوص جہت انہیں کرداروں کے وسیلہ سے سامنے آتی ہے۔ شہبا سے ملاقات سے پہلے راوی کا کردار ایک تکنیکی نوعیت کا محسوس ہوتا ہے لیکن اس سے ملاقات کے بعد احساس ہوتا ہے کہ راوی جذباتی طور پر اس کردار سے وابستہ ہوگیا ہے مگر یہ وابستگی اس کی مہم میں رکاوٹ نہیں بنتی ہے بلکہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ہر شے کو پس پشت ڈالتا چلا جاتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تمام ضمنی کردار جو اس قصہ میں راوی کے معاون رہے اپنی بیماری یا بڑھاپے کے سبب لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ شہبا کے تعاون سے وہ جہاں دار بیگم کی حویلی میں اس مسودہ کو تلاش کر لیتا ہے اور جب اس کو پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ امراؤجان ادا اولاد والی تھیں۔ راوی نے بڑی مہارت سے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ امراؤجان کا واقعہ سچا ہے اور اس (ناول) کو مرتب کرتے وقت جس قسم کی ترمیم کی گئی تھی اس کا اصل

مسودہ بھی موجود ہے۔اقتباس اس طرح ہے؛۔

''کہانی امراؤجان کی (قصہ ایک شریف زادی کے طوائف بن جانے کا)

میں یعنی مرزا محمد ہادی رسواؔ اس ناول کے پڑھنے والوں کے سامنے لکھنؤ کی ایک سچی اور اصلی کہانی پیش کررہا ہوں۔یہ کہانی ایک بڑے رئیس کی حویلی سے ایک کمسن بچی کے غائب ہوجانے اور کوٹھے پر پہنچ کر ایک مشہور طوائف بن جانے کی ہے۔

صاحبو! میں اس کہانی کو ہرگز نہ لکھتا اگر اس میں حزن والم کے مرقعے موجود نہ ہوتے۔اس کے لکھنے کا مقصود یہ بتانا ہے کہ حویلیوں اور محلوں کی تہذیب جگہیں بدل جانے کے باوجود اپنی شکل نہیں بدلتی اور اس کا مقصود یہ دکھانا بھی ہے کہ اصالت کے قامت پر شرافت کا جامہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔غدر کے بعد لکھنؤ میں جو کچھ ہوا اور جس طرح ہوا قارئین اس قصے میں پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔

قصہ نویس، مرزا محمد ہادی المتخلص رسواؔ''(۶)

اس کے بعد جب راوی اصل قصہ کا مطالعہ کرنا شروع کرتا ہے تو گویا وہ امراؤجان ناول کا اصل مسودہ پڑھ رہا ہوتا ہے اور راوی کی یہ پڑھت کئی صفحات کو محیط ہے۔ان صفحات میں بیان کیے گئے واقعات ایک متن پر دوسرے متن کو تشکیل دینے کی اچھی مثال ہیں جن میں امراؤجان اپنے حالات زندگی بیان کررہی ہوتی ہیں۔لیکن اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ ناول کے متن کی تشکیل کسی پہلے سے موجود متن کی بنیاد پر کی گئی ہے راوی کا مقصد سچ کو سامنے لانا ہے اور اس اعتبار سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امراؤجان کی اصل کہانی وہ نہیں جو شائع ہوچکی ہے بلکہ وہ ہے جو ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔لہذا قصہ کی معنویت تبدیل ہوجاتی ہے اور امراؤجان اور اس قبیل کی دوسری عورتیں شرفا کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں جو وقت اور حالات کی ستم ظریفی کے باعث اس حال کو پہنچیں۔مسودہ تلاش کرنے کی راوی کی مہم کا اختتام یہیں ہوجاتا ہے لیکن ایک دوسری مہم کا آغاز ہوتا ہے جس کا سبب پس نوشت تحریر کردہ امراؤجان کا یہ جملہ ہے کہ؛''گاہے گاہے میری بیٹی شمیلہ کی خیریت لیتے رہیے گا۔میں اسے ناچ گانے کے پیشے میں نہیں لانا چاہتی۔''ص ۱۹۰۔راوی شمیلہ بیگم کی تلاش میں گھر سے روانہ ہوتا ہے اور انہیں تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے۔ناول کا راوی مرکزی کردار نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اندر مرکزیت کو سمیٹے ہوئے ہے۔اس کا عمل، ردعمل اور طرز فکر ہی کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں معاون ہیں۔کہانی کی بیانیہ ہیئت میں مکالماتی طرز غالب ہے جو قصہ کو با اثر بناتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو؛۔

''پوچھو صاحبزادے کیا پوچھنا ہے۔''شمیلہ خانم نے کہا

''پہلے بتادوں اصل قصے میں کیا ہے''۔میں نے کہا۔پھر جو کتاب جہاں دار بیگم کے یہاں ملی تھی، اس میں لکھا ہوا پورا قصہ شمیلہ خانم کو بتایا۔قصہ سن کر وہ بولیں:''سچ تو یہ ہے، یہی ہماری ماں کا اصل قصہ ہے۔''پھر بولیں:''اماں نے جب ہمیں کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی، بتایا تھا انہوں نے کسی کو جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے، اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان صاحب نے اس قصے کو بہت کچھ لکھ بھی ڈالا ہے''۔یہ بتا کر شمیلہ خانم نے بتایا:''لیکن وہ قصہ اماں کی زندگی میں نہیں چھپا اور اچھا ہوا نہیں چھپا۔اماں نے ان صاحب کو منع کیا تھا کہ اس قصے کو عام نہ کیا جائے۔''(۷)

واقعات کے بیان میں راوی نے موقع محل کی مناسبت سے لکھنؤ کے مخصوص مقامات کے ان مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو لکھنؤ کی شان اور وہاں کی تہذیبی ماحول کا حصہ سمجھی جاتی ہیں۔جن میں جزئیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔مثال کے طور پر ٹنڈے کباب اور اس کے لوازمات کا بیان۔ساتھ ہی ان مناظر کا بھی بیان نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے جس کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ قصہ سے ہے اور اصل واقعہ کو مستند اور معتبر بنانے میں مددگار رہے۔لہذا اس اعتبار سے جہاں جہاں روئداد کا بیان کیا گیا ہے اس مقام پر راوی نے دکھانے کے عمل کو فنی پیرائے میں پیش کیا ہے۔راوی متن کو دلکش بنانے کی غرض سے روئداد بیان کرنے کے کئی طریقوں کا استعمال کرتا ہے۔کبھی وہ کسی جگہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے جس میں راوی کا مقصد اس ماحول کو پیش کرنا ہوتا ہے جن سے متعلق اشیا کو وہ بیان کررہا ہوتا ہے مثال کے طور پر صفحہ نمبر ۱۹ پر جب راوی نادر آغا جو نوادرات کا کام کرتے ہیں کے یہاں داخل ہوتا ہے تو اس کا بیان یوں کیا گیا ہے کہ:۔

''میں اندر داخل ہوا تو دیکھا ایک بڑے کمرے میں جو کبھی بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہوگا، چاروں طرف تخت بچھے ہیں، جن پر طرح طرح کے پرانے سامان قرینے سے رکھے ہیں۔ان سامانوں میں نقشی پاندان، حقے، جربیں ، خاصدان اور سرمہ دانیاں۔قد آدم آئینے، اگالدان، چپکنیں، اچکنیں اور زرکالے دوشالے، سلفچیاں، آفتابے، سماور اور میر فرہ، بہت عمدہ نقاشی والے چینی کے برتن اور نایاب نگوں والی انگوٹھیاں تھیں۔''(۸)

اور کبھی وہ کسی منظر کو عمل کی حالت میں دکھاتا ہے جس سے راوی کا موقف واقعہ کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے۔راوی جب شمیلہ بیگم کے مکان میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت کا منظر اس طرح ہے؛۔

''ان تصویروں کے بیچ ایک بہت بڑی تصویر میں اچھے قدوقامت اور سڈول جسم کی بہت تیکھے ناک نقشے والی ایک عورت کو رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔یہ رقاصہ گھٹنوں سے نیچے

تک آئی ہوئی بہت سی کلیوں والی اودے رنگ کی پشواز پہنے ہوئے تھی جو اوپر سے تنگ اور نیچے سے گھیر دار تھی۔ اودے رنگ کی اس پشواز کے نیچے اس نے سفید چوڑی دار پائجامہ پہن رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جڑاؤ کنگنوں کے ساتھ ہلکے سبز رنگ کی آٹھ آٹھ چوڑیاں تھیں۔ عورت اپنے پنجوں پر کھڑی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اس کے سینے پر تھا اور بائیں ہاتھ کا پنجہ ہوا میں لہراتا ہوا کسی پھول کی تصویر بنا رہا تھا۔ اس شکل میں اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھاؤ بتا رہی ہو۔ عورت کے پیروں میں گھنگرو اس طرح پہنائے گئے تھے کہ اگر انہیں دیر تک دیکھا جائے تو وہ بجتے ہوئے معلوم ہونے لگیں۔''(۹)

درج بالا اقتباس میں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ یہ امراؤ کی تصویر ہے لیکن اس پیکر تراشی سے گمان ہوتا ہے کہ یہ ضرور امراؤ جان کی تصویر ہوگی۔ جس کا ناول کے کرداروں سے خصوصی تعلق ہے متن میں اس قسم کی اور بھی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ راوی نے محرم کی مجلسوں اور رسوم ورواج کے بیان کے سلسلے میں ضمنی کردار سبیلہ جو شمیلہ خانم کی بیٹی تھی بہت مدد لی ہے جس سے لکھنؤ کی تہذیب عیاں ہوتی ہے۔ ناول میں موجود وہ تمام ضمنی کردار جو اس قصہ کے ارتقا میں معاون تھے اپنی بیماریوں کے سبب موت کے منھ میں چلے جاتے ہیں۔ ناول کے آخر میں جب شمیلہ خانم کا انتقال ہوجاتا ہے اس کے چند ہی صفحات کے بعد راوی نے سبیلہ کی موت تک کا وقفہ بہت تیزی سے طے کیا ہے۔ مگر اس کو طول دینے کا کوئی سبب بھی بظاہر نظر نہیں آتا ہے۔ ناول کے اختتام پر جب راوی کربلا ملکہ جہاں پہنچتا ہے جہاں راوی کے مطابق ہینگا موجود تھی اور وہ ہینگا سے سبیلہ کے ساتھ گذارے پچھلے محرم کے دنوں کے متعلق بیان کرنے لگتا ہے تو اچانک یہاں راوی کا بیان تبدیل ہوجاتا ہے اور وہ ہینگا کے بجائے سبیلہ کو تصور کرنے لگتا ہے۔ یہاں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس تلاش وجستجو میں قصہ اور کرداروں سے وابستگی کا شدید اثر راوی کے دماغ میں ایک قسم کا خلل پیدا کردیتا ہے ایسا خلل جس میں اس کی اپنی ذات منتشر ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے بیان میں کردار کی عدم موجودگی کے باوجود اس کی موجودگی کا ذکر کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے وہ ہینگا کو سبیلہ کہہ کر بیان کرنے لگتا ہے جبکہ حقیقت میں وہاں ہینگا بھی نہیں ہوتی ہے۔ ناول کا یہ اختتام قصہ کو مزید مستحکم بناتا ہے اور وہ قصہ میں حقیقت کا رنگ بھرنے میں

> جب راوی اصل قصہ کا مطالعہ کرنا شروع کرتا ہے تو گویا وہ امراؤ جان ناول کا اصل مسودہ پڑھ رہا ہوتا ہے اور راوی کی یہ پڑھت کئی صفحات کو محیط ہے۔ ان صفحات میں بیان کیے گئے واقعات ایک متن پر دوسرے متن کو تشکیل دینے کی اچھی مثال ہیں جن میں امراؤ جان اپنے حالات زندگی بیان کررہی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ ناول کے متن کی تشکیل کسی پہلے سے موجود متن کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

معاون ہے اقتباس اس طرح ہے بقول راوی، سبیلہ اس سے کہتی ہے:۔

''جو موج آگے نکل جاتی ہے واپس نہیں آتی۔ اٹھیے جھٹ پٹا ہو چکا ہے۔''

ہم کوٹھی فرح بخش کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جب موتی محل سے پہلے والے پل پر پہنچے تو میں نے ہینگا کو بتایا:

''یہیں سبیلہ کی طرف بہت سے بندر لپکے تھے اور وہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔'' یہ کہہ کر میں آگے والے پل کی طرف چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا ہینگا میرے ساتھ نہیں ہے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بہت دور تک ہینگا نظر نہیں آئیں۔ میں نے زور زور سے پکارنا شروع کیا: ہینگا، ہینگا۔''(۱۰)

ناول کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں راوی اور کرداروں کے درمیان جذباتی لگاؤ کا اظہار براہ راست نہیں کیا گیا ہے بلکہ بات کرنے کے انداز، لب ولہجہ اور لفظوں کے دروبست سے اس کو محسوس کرایا گیا ہے خواہ وہ جذباتی لگاؤ شہبا اور راوی کے درمیان ہو یا دوسرے کرداروں کے درمیان۔ کردار کے کسی جذبے یا رویے کو بتانے کا بیان عام طور پر ناولوں میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اسے محسوس کرانے کا انداز بیان کم ملتا ہے جو قاری کے جذبات کو انگیز تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی متن کی تشکیل اور اس کی ساخت میں معنویت پیدا کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ناول میں واحد متکلم راوی اور زبان و بیان کے طریقہ کار کی مختلف جہتیں سامنے آتی ہیں جو ناول کی تاریخ میں اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حواشی:

۱۔ ص ۴۷، ۴۸ نوجوان ناول نگار کے نام خط، ماریو برگس یوسا، ترجمہ محمد عمر میمن، شہرزاد کراچی، ۲۰۱۰

۲۔ ص ۹ خواب سراب، انیس اشفاق، سب کتب فروش اور اشاعتی ادارے، ۲۰۱۷

۳۔ ص ۱۰ ایضاً

۴۔ ص ۲۰ ایضاً

۵۔ ص ۲۰، ایضاً

۶۔ ص ۱۵۷، ایضاً

۷۔ ص ۲۳۵۔۲۳۶، ایضاً

۸۔ ص ۱۹، ایضاً

۹۔ ص ۲۲۹ ایضاً

۱۰۔ ص ۴۵۲، ایضاً

❑❑❑

ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے لئے سرگرم یوگی سرکار

وزیر اعلیٰ کے ۱۶ ماہ میں ۷۵ اضلاع کے تاریخی دورے

محمد غفران نسیم

۲/۷، پاٹا نالہ، لکھنؤ
رابطہ: 9450401073

کسی بھی خطہ، ریاستی یا ملک کی ترقی اور بہتر نظام کا دارومدار وہاں کے حاکم کی مستعدی، دلچسپی، سنجیدگی اور پالیسی پر منحصر ہوتا ہے اور جب ریاست کا سربراہ، حاکم اعلیٰ خود ان اسکیموں، ترقیاتی پروجیکٹ، سرکاری اداروں اور مقامی کاموں کی نگرانی کرتا ہے تو یقینا کام بخوبی انجام پاتے ہیں۔ اتر پردیش آبادی کے ساتھ ساتھ رقبہ کے اعتبار سے بھی ایک بڑی ریاست ہے۔ اس کی اہمیت، وافضلیت سیاسی، سماجی، اقتصادی اور آبادی کے اعتبار سے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اتنی خطیر آبادی اور 75/اضلاع پر مبنی ریاست کے انتظامات کرنا اور تمام اضلاع کی ترقیات اور نظم ونسق پر کنٹرول رکھنا کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ریاست کا سربراہ تمام نکات پر خود نگاہ رکھے، ریاستی سطح کے ساتھ ساتھ ضلع اور مقامی سطح کے معاملات کا جائزہ لینے کی فکر کرے۔ صرف فکر ہی نہیں بلکہ اسی فکر اور توجہ کے پیش نظر خود اضلاع کا دورہ کرے تو یقینا ریاستی سطح سے لے کر مقامی سطح تک تمام انتظامی امور بحسن خوبی انجام پاتے ہیں۔ جب ریاست کے سربراہ کا کسی بھی ضلع، تحصیل، بلاک کا دورہ ہوتا ہے تو از خود وہاں کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ مقامی اور ضلع کے حکام دن رات ایک کر کے وہاں کے ترقیاتی کاموں، سرکاری پروجیکٹوں، تعمیری کاموں اور اسکیموں کو مکمل کراتے ہیں۔ اس سے وہاں کے مکینوں کو سرکار کی منشا کے مطابق اسکیموں، پروجیکٹوں، پالیسیوں اور سہولیات کا فائدہ ملنے لگتا ہے۔ اس ضمن میں ریاست اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ کہ اقتدار میں آنے کے بعد محض 16 مہینوں میں اتر پردیش کے تمام 75 اضلاع کے دورے کر کے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ اس اعتبار سے ہر ماہ تقریباً 5/اضلاع کا دورہ کیا۔ کسی بھی وزیر اعلیٰ کے لیے اپنے مصروف ومشغول ترین پروگرام کے درمیان ہر مہینہ متعدد اضلاع کے دورہ کے لیے وقت نکالنا اور ان اضلاع سے متعلق ترقیاتی، تعمیری کاموں، سرکاری اسکیموں اور پروجیکٹوں کا جائزہ لینے کے لیے خود موقع پر پہنچنا، یقینا ایک تاریخی قدم ہے۔ پھر یہ کہ اضلاع کے یہ دورے صرف ضلع اور متعلق افسران سے ملاقات کرنے تک ہی دورہ محدود نہیں رہے، بلکہ وہاں مقامی عوام سے بھی ملاقاتیں کی۔ انہیں سرکاری اسکیموں سے مستفیض کرنے کے افسران کے دعویٰ کا مشاہدہ بھی کیا۔ مستفیدین سے ملاقاتیں کرنا، ان سے براہ راست معلومات حاصل کرنا یہ وزیر اعلیٰ کے زمینی سطح تک کام کو پہنچانے کے عزم کا عکاس ہے۔

مرکز کی مفاد عامہ سے متعلق اسکیمیں ہوں یا حکومت اتر پردیش کے پروجیکٹ وزیراعلیٰ کی نظر ہر جانب رہی۔انہوں نے جہاں کلین انڈیا مشن کے تحت عزت گھروں (اجابت گھر) کی تعمیر کے نشانہ کو حاصل کرنے پر زور دیا وہیں وزیراعظم رہائش اسکیم (شہری و دیہی)، وزیر اعظم اجولہ اسکیم، سوبھاگیہ اسکیم نیز اسمارٹ سٹی مشن پر بھی پوری توجہ مرکوز کی۔اسی طرح ریاست میں کسانوں کے فصلی قرض کو معاف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فصلوں کی سہارا قیمتوں میں اضافہ، کاشتکاروں کو خریداری مراکز پر بھی تمام سہولیات مہیا کرانے اور ان کی فصل کی رقم براہ راست ان کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرانے کی پالیسی کی نگرانی بھی کرائی، تاکہ کاشتکاروں کو کسی طرح کی شکایت و دشواری نہ ہونے پائے۔

اگر 2018 کی بات کی جائے تو اس سال کے آغاز میں فروری میں انویسٹر سمٹ نے ایک تاریخ رقم کی، جس میں ملک کے بڑے ، مشہور سرمایہ کاروں، صنعتی گھرانوں اور اداروں کے علاوہ مختلف ممالک کے سرکاری اور غیر سرکاری سرمایہ کاروں نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنی پسند اور دلچسپی کے مطابق صنعتی یونٹ لگانے اور تجارتی ادارہ قائم کرنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس قدر بڑے پیمانے پر سرمایہ کاروں اور صنعتی گھرانوں کو مدعو کیا گیا، ان کی بات سنی اور سمجھی گئی نیز انہیں اتر پردیش میں صنعتی سرگرمیاں شروع کرنے کی دعوت دی گئی۔جس وقت یہ تمام پروجیکٹ اور صنعتی یونٹیں شروع ہوجائیں گی تو یقیناً اس کا فائدہ ان گھرانوں کے علاوہ اتر پردیش کے عوام، یہاں کے مقامی تاجروں، کاشتکاروں، مزدوروں کو بھی حاصل ہوگا۔

اس برس وزیراعلیٰ نے جن اضلاع کے

اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ایودھیا میں جنوبی کوریا کی پہلی خاتون محترمہ کم جونگ سوک کے ساتھ نیا گھاٹ پر سریو جی کی پوجا کرتے ہوئے (۶/نومبر ۲۰۱۸ء)

دورے کئے یا اہم لوگوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ان میں مندرجہ ذیل کی مختصر تفصیل قارئین کی نذر ہے۔

8 جنوری 2018 کو لکھنؤ میں وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے نیپال کے سابق شاہ گیانیندر بیر وکرم شاہ

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بلرامپور میں پاٹیشوری پبلک اسکول میں اجولہ اسکیم کے مستفید کو سرٹیفکٹ پیش کرتے ہوئے (۳۰/نومبر ۲۰۱۸ء)

سے ملاقات کی اور انہیں کمبھ-2019 کا لوگو پیش کیا۔

12 جنوری 2018 کو ضلع گوتم بدھ نگر واقع گوتم بدھ یونیورسٹی میں یونیورسٹی انتظامیہ اور پروفیسران کے ساتھ میٹنگ کی۔

3 فروری 2018 کو ضلع رام پور میں 'سماجی اختیارات کیمپ' میں شرکت کی اور اس موقع پر معذور افراد کو آلات بھی تقسیم کئے۔

25 فروری 2018 کو شاہجہانپور کے دورہ کے دوران متعدد ترقیاتی کاموں کا سنگ بنیاد رکھا نیز مکمل پروجیکٹ عوام کو معنون کئے۔ اس کے بعد 22 اپریل 2018 کو شاہجہانپور کے گنا خریداری مرکز کا اچانک دورہ کرکے وہاں کسانوں سے ملاقات کی اور مسائل دریافت کئے۔

12 مارچ 2018 کو وندھیاچل ڈویژن میں وزیراعظم نریندر مودی اور فرانس کے صدر ایمونوال میکرو کے ساتھ شمسی توانائی کا پلانٹ عوام کو معنون کیا۔

وزیراعلیٰ نے 29 مارچ 2018 کو ضلع بستی کے منڈیروا؛ میں 5000 ٹی سی ڈی پیرائی صلاحیت کی نئی شکر مل اور 27 میگاواٹ کے، کو۔ جنریشن پلانٹ کا سنگ بنیاد رکھا۔ 30 مارچ 2018 کو غازی آباد میں ایلی ویٹیٹ روڈ کا بٹن دبا کر افتتاح کیا۔

24/اپریل 2018 کو وزیراعلیٰ نے ضلع سلطانپور کا دورہ کیا۔ اس موقع پر افسران کے ساتھ میٹنگ کے علاوہ قومی یوم پنچایتی راج کے موقع پر ہوئی تقریب میں بھی خطاب کیا۔

26 اپریل 2018 کو ضلع امروہہ کے دورہ پر

’گرام سوراجیہ اجلاس‘ کے موقع پر مختلف ترقیاتی پروجیکٹ عوام کو معنون کئے۔

27اپریل 2018 کو ضلع بلند شہر کے دورہ میں نظم ونسق وترقیاتی کاموں کا جائزہ لینے کے علاوہ نمائش گراؤنڈ میں متعدد پروجیکٹ کا سنگ بنیاد رکھا۔

ریاستی حکومت نے ٹرانسپورٹ کے سیکٹر میں عوام کو بہتر سہولیت مہیا کرانے کے لیے متعدد اہم اقدامات کئے ہیں۔ اس کے تحت مختلف ہمسایہ ریاستوں کے علاوہ دوردراز کی ریاست جموں کشمیر کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملک نیپال تک اتر پردیش ریاستی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے اپنی خدمات شروع کی ہے۔ اس کے تحت وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے 12 مئی 2018 کو جنک پور (نیپال) سے اجودھیا تک براہ راست بس سروس کے مسافروں کا اجودھیا میں استقبال کیا۔

27رمئی 2018 ضلع بدایوں کا دورہ کیا۔

27 مئی 2018ہی کو ضلع باغپت میں گورنر رام نائک اور وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی موجودگی میں وزیراعظم نریندرمودی کے بدست ’ایسٹرن پیری فیرل ایکسپریس۔وے‘ عوام کو معنون کیا گیا۔2جون 2018 کو ضلع ہردوئی میں متعدد ترقیاتی پروجیکٹ کا سنگ بنیاد رکھا نیز مکمل پروجیکٹ عوام کو معنون کئے۔

اسی ضمن میں 3جون 2018 کو مرزا پور میں ڈویژنل افسران کے ساتھ جائزہ میٹنگ کی۔اسی روز وزیراعلیٰ نے ضلع بھدوئی میں متعدد ترقیاتی پروجیکٹ کا سنگ بنیاد رکھا،مکمل پروجیکٹ عوام کو معنون کئے نیز مختلف مفاد عامہ کی اسکیموں سے ضرورت مندوں،اہل عوام کو مستفید کیا۔

28جون 2018 کو ضلع سنت کبیر نگر میں صوفی سنت کبیر داس کی یاد میں قائم ہونے والی سنت کبیر اکادمی،کا وزیراعظم نریندمودی کے بدست سنگ بنیاد رکھا گیا،اس موقع پر وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے بھی عوام کو خطاب کیا۔

7جولائی 2018 کو ضلع سون بھدر میں 90.5ارب کے پروجیکٹ کا سنگ بنیاد رکھنے اور مکمل پروجیکٹ عوام کو معنون کرنے کے علاوہ ترقیاتی کاموں اور نظم نسق کا جائزہ کیلئے افسران کے ساتھ میٹنگ بھی کی۔

9جولائی 2018 کو وزیراعلیٰ نے مرادآباد میں زیر تربیت معاون استغاثہ افسران کے تربیتی پروگرام کی اختتامی نشست میں شرکت کی۔اور شرکاء کو سرٹی فکیٹ تقسیم کئے۔اسی روز وزیراعلیٰ نے سنبھل ضلع کا دورہ کیا،افسران کے ساتھ جائزہ میٹنگ کے علاوہ پرائمری اسکول کا معائنہ بھی کیا۔اس موقع پر بچوں کو اسکول بیگ بھی تقسیم کئے۔

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بلرامپور میں پائلٹ شوری پبلک اسکول میں منعقد پروگرام میں ایک خاتون کو سرٹیفکٹ پیش کرتے ہوئے (۳۰رنومبر ۲۰۱۸ء)

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور کے موضع ونٹا نگیا میں ایک مستفید خاتون کو سرٹیفکٹ دیتے ہوئے (۷رنومبر ۲۰۱۸ء)

ریاستی حکومت بلکہ وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی پہل پر ثقافتی سیاحت کو فروغ دینے کے منصوبہ کے تحت اجودھیا میں دیوالی منائی گئی۔اس کے تحت 3لاکھ دیپک ایک ساتھ روشن کئے گئے، جو بین الاقوامی سطح پر ایک رکارڈ کے بطور درج ہوئے۔ جب دیپک روشن ہوئے تو ناظرین نے جو منظر دیکھا وہ آسمان میں چمکتے ستاروں کے زمین پر اتر آنے کے مترادف تھا۔اس تاریخی موقع پر جہاں لاکھوں لوگ شاہد ہوئے وہیں جنوبی کوریہ کی خاتون اول محترمہ کم جونگ سک کی موجودگی نے اس کے وقار میں مزید اضافہ کردیا۔اس برس دیو دیپاولی ۲۳رنومبر ۲۰۱۸ء کو بنارس میں منائی گئی۔ اس موقع پر اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک ، وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ،بہار کے گورنر جناب لال جی ٹنڈن کے علاوہ ریاستی وزراء بھی بڑی تعداد میں موجود رہے۔ اس موقع پر گورنر موصوف نے کہا کہ دیودیوالی میں اس قدر دیپک روشن کرنے سے اجودھیا کو بین الاقوامی سطح پر نئی شناخت ملی ہے۔وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اور جنوبی کوریا کی خاتون اول نے نیا گھاٹ پر پوجا اور آرتی بھی کی۔

❑❑❑

'اتالیق بی بی' ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے جو اپنے اندر بیک وقت ناولٹ، خاکہ، انشائیہ، افسانہ اور مزاحیہ کا لطف رکھتی ہے۔ ویسے تو اس کا پلاٹ تیار کرنے میں چودھری صاحب نے انگریزی کتاب 'کریٹن پکچرز' سے استفادہ کیا ہے لیکن اپنے منفرد اسلوب، شگفتہ زبان، روز مرہ اور محاوروں کا برمحل استعمال، صنف نازک کی نفسیات کی بھرپور عکاسی اور کتاب میں پیش کئے گئے خالص مشرقی ماحول نے اس کتاب کو چودھری صاحب کی طبع زاد تصنیف بنا دیا ہے۔ بقول پروفیسر شارب ردولوی:

''اتالیق بی بی ایک ایسا البم ہے جو ہمیں اس جاگیردارانہ عہد کے زوال کی ایسی نفیس تصویر دکھاتا ہے جو کسی دوسری جگہ ملنی ممکن نہیں۔ آج بعض لوگوں کو اس میں ہونے والی گفتگو میں شاید بہت دلچسپی محسوس نہ ہو لیکن اس کا ہر باب ایک ایسی معاشرت اور ایسی تہذیب کو پیش کرتا ہے جس کی جھلکیاں محمد علی ردولوی کے بعد کبھی ہمیں قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔ جو خود چودھری محمد علی ردولوی سے بہت متاثر تھیں۔''

چودھری محمد علی ردولوی اردو ادب کے ایک مایۂ ناز ادیب ہیں جنہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں کشکول محمد علی شاہ فقیر، گویا دبستان کھل گیا، گناہ کا خوف، میرا مذہب، اتالیق بی بی وغیرہ شامل ہیں۔

ان میں سے ہر کتاب اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ جہاں تک 'اتالیق بی بی' کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ ان کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کا ثبوت ان کے مکتوبات کے مجموعے 'گویا دبستان کھل گیا' سے بھی فراہم ہوتا ہے۔ البتہ اس کتاب کے سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ اس کا پہلا ایڈیشن دستیاب نہیں ہے۔ پھر بھی محققین کا خیال ہے کہ اس کتاب کی اولین اشاعت بیسویں صدی کے پہلے دہے کے آخر یا دوسرے دہے کے اوائل میں میں ہوئی ہوگی۔

لائق مبارکباد ہیں ڈاکٹر انور حسین خاں کہ انہوں نے محنت شاقہ سے کام لیتے ہوئے اس کتاب کا مسودہ پاکستان سے حاصل کیا جسے چودھری صاحب کے نواسے سید کاظم علی نے ان کی دو اور تصانیف 'کشکول محمد علی شاہ فقیر' اور 'گناہ کا خوف' کو یکجا کر کے

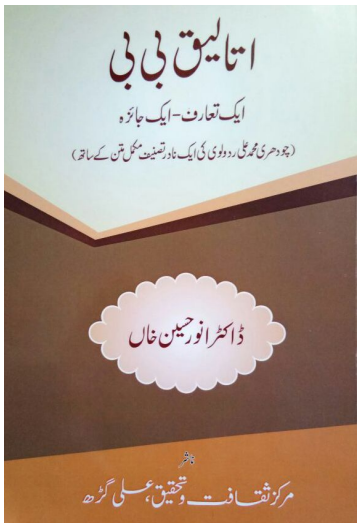

مبصر : نجیب انصاری
قیمت : 50 روپئے
ناشر : مرکز ثقافت و تحقیق، علی گڑھ

ملنے کا پتہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

اردو اکادمی، سندھی، کراچی، پاکستان سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر انور حسین نے 'اتالیق بی بی' کا متن اسی مجموعے سے لیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں 'اتالیق بی بی' کے مکمل متن کے ساتھ ساتھ اس کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے محاسن و معیار کا جائزہ لیتے ہوئے اردو ادب میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور حسین خاں:

''حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا پلاٹ، کردار، زبان، حالات، معاشرہ نیز اقتصادی و معاشرتی زندگی سے خالص ہندوستانی شناخت کا اظہار ہوتا ہے۔ کتاب میں نسوانی سیرت و کردار کی ایسی حقیقت افروز و دل آویز منظر کشی ہوئی ہے جو زبان و مکان و ملک کی مصنوعی قیود و پابندیوں سے بالاتر ہے۔ در اصل عورتوں کی یہ نفسیات و کیفیات سبھی جگہ موجود ہوتی ہے۔ کتاب میں مصنف نے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے، وہ بہت پُرکشش اور لطیف ہے۔ بڑی خوبی کے ساتھ ادبی زبان میں مقامی زبان کی پیوند کاری کر کے چار چاند لگا دئے ہیں۔''

'اتالیق بی بی' میں کچھ ایسے محاورے اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اب اردو ادب میں رائج نہیں ہیں۔ ڈاکٹر انور حسین نے ایسے مشکل الفاظ، محاوروں، فارسی اشعار نیز ضرب الامثال کے معنی، مطالب اور تشریح کو کتاب کے آخر میں شامل کر کے اس کی اہمیت و افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ان سے ایک جگہ بڑی چوک بھی ہوگئی ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

یہ شعر چھٹے باب میں درج کیا گیا ہے جس کے مصرعۂ اولیٰ میں غلطی در آئی ہے اور یہ مصرعہ اس طرح درج کیا گیا ہے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ مصرعہ 'فرہنگ و حواشی' کے تحت بھی غلط درج کیا گیا اور اس کی اسی طرح تشریح بھی کر دی گئی۔

امید ہے آئندہ ایڈیشن میں یہ اور پروف کی چھوٹی موٹی غلطیوں کو درست کر لیا جائے گا۔

❑❑❑

لئیق رضوی رثائی ادب کے ان سنجیدہ ناقدین میں گنے جاتے ہیں جو لکھتے تو کم ہیں لیکن جس موضوع کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اس کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔لئیق رضوی تحقیق وجستجو کو جو معیار عطا کرتے ہیں وہ انھیں ایک محتاط مصنف کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی مصروف زندگی کے باوصف وہ کچھ نہ کچھ الگ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔عوامی مرثیے کو انھوں نے اپنی مصروف زندگی کا حصہ بنایا اور ہر اس علاقے میں جانے کی کوشش کی جہاں یہ روایت موجود تھی۔ان کی کتاب ''عوامی مرثیے کی روایت'' دراصل ہندوستانی علاقائی /عوامی زبان کے رثائیات کی بازیافت ہے۔ان کی یہ تلاش لگ بھگ ربع صدی پر محیط ہے۔ لئیق رضوی نے ادب کے قارئین کے سامنے اپنی پہلی کتاب پیش کی ہے لیکن ان کا طریقۂ کار نہایت ہی مجرب ہے۔انھوں نے کتاب کی پیشکش میں سائنٹیفک طریقۂ کار اپناتے ہوئے اس کو گیارہ ابواب پر منقسم کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کا پہلا باب'' ہندوستان میں عزاداری'' سے متعلق ہے لیکن دوسرا باب'' عزاداری میں ہندوستان'' پیش کر کے لئیق رضوی نے جدت کا ثبوت فراہم کیا ہے اس لئے کہ ہندوستان میں عزاداری پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن عزاداری میں ہندوستان جیسے موضوع پر کم لکھا گیا ہے۔لئیق رضوی ہندوستان کی عزاداری کے تعلق لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان کی عزاداری میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان کی عزاداری کا خاص امتیاز اور غالب رنگ اس کی مشترکہ تہذیب اور سماج کی اجتماعی شرکت ہے'' حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان میں محرم کسی مذہب، فرقہ، برادری تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستانی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ کشمیر سے کنیا کماری تک پورے ہندوستان کی کوئی بھی زبان ہو رثائی ادب کا عظیم الشان سرمایہ موجود ہے۔''عوامی مرثیے کی روایت'' کا تیسرا باب'' غم

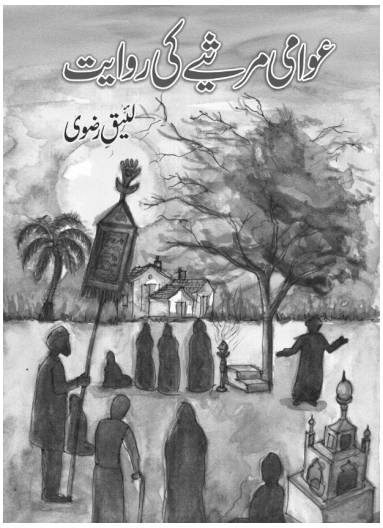

مبصر : عابد حسین حیدری
قیمت : 250 روپئے
ناشر : قلمکار، کریلی، الٰہ آباد
ملنے کا پتہ
کریلی، الٰہ آباد

حسین کے عوامی اظہارات'' ہے جبکہ چوتھا باب ''عوامی مرثیہ، رنگ، روپ اور رویہ'' پر محیط ہے۔ کتاب کا پانچواں، چھٹا اور ساتواں باب بالترتیب شمالی ہند، پنجاب اور دکن کے عوامی مرثیوں کی روایت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔آٹھواں باب ''دہوں کی دنیا'' کے عنوان سے موسوم ہے جبکہ دسواں باب ''اردو رثائی شاعری پر عوامی ادب کے اثرات'' رثائی شاعری اور عوامی ادب کا خوبصورت محاکمہ کرتا نظر آتا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے دکنی رثائی شاعری سے قلی قطب شاہ، ملک خوشنود، اعتقادی، محمد قلی کی عوامی شاعری یا لوک شاعری سے مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دکن سے لیکر شمال تک ایسے نوحوں اور مرثیوں کی انتہائی جاندار روایت موجود ہے۔لئیق رضوی کا خیال ہے کہ ''ان کی داخلی فضا بالکل ہندوستانی ہے۔'' انھوں نے شمالی ہند کی اس عوامی رثائی شاعری سے بھی استفادہ کیا ہے جس کے سرِ خیل سکندؔر اور سوداؔ ہیں انھوں نے بطور مثال سوداؔ کا مشہور مرثیہ ''کیا چرخ واژگاں کا ستم اب کروں بیاں'' پیش کیا ہے جس میں سوداؔ نے برج بھاشا کا استعمال کر کے اسے عوامی بنا دیا ہے۔لئیق رضوی نے سوداؔ کے علاوہ سکندؔر کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جنھوں نے اردو کے علاوہ پنجابی، ماروا ڑی، برج اور اودھی جیسی عوامی بولیوں میں درد انگیز مرثیے کہے ہیں۔کتاب کا آخری باب ''انتخاب عوامی مرثیہ'' ہے جس میں انھوں نے زاریوں اور دہوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس باب میں بھی ان عوامی رثائی اصناف کے علاوہ ہندی نوحوں، برہا، لاوَنی، چہار بیت اور بھوجپوری روایتوں کا بھی انتخاب کرتے تو رثائی ادب کے قارئین مزید مستفید ہوتے۔بہر حال ''عوامی مرثیے کی روایت ''ایک ایسی تالیف ہے جو نہ صرف یہ کہ موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے بلکہ اس کی ترتیب وتکمیل میں ابتدا سے انتہا تک تلاش وجستجو، اجتہادانہ کاوش اور مولف کی مخلصانہ پیشکش نظر آتی ہے۔

❑❑❑

آپ کے خطوط

نیادور، اکتوبر کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ 'رثائی ادب' اردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ عہد حاضر میں رثائی ادب پر مخصوص نمبر نکال کر آپ نے یقیناً قابل ستائش قدم اٹھایا ہے کیونکہ اس شمارے کے بیشتر مضامین رثائی ادب سے متعلق ہیں لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج جب کہ نئی نسل اپنے اس بیش قیمت اثاثے سے تقریباً بیگانہ ہے، ایسے حالات میں اس کو زبان وادب کے اس اہم دستاویز سے واقف کرانا قابل تحسین ہے۔ اس مخصوص موضوع پر مضامین کا انتخاب معیاری، عمدہ اور محققانہ ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے مضامین قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ اسے یہ احساس دلاتے ہیں کہ یہ صنف عہد حاضر میں زندہ ہونے کے علاوہ اپنی خصوصی ادبی اہمیت رکھتی ہے۔ شمارے میں شامل روشن تقی، لئیق رضوی اور عادل فراز کے مضامین نے متاثر کیا۔

آپ کے خوبصورت، جامع مگر مختصر اداریہ کو پڑھ کر احساس ہوا کہ آپ دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ اتنے کم الفاظ میں نیادور کی طویل تاریخ، اس کے خصوصی نمبروں، اس کے مدیران، رثائی ادب، مہاتما گاندھی، اردو زبان سے محبت اور ہمارے بزرگ ادباء وشعراء کی رحلت پر اظہار خیال ہے۔ کیا کچھ نہیں سمیٹ لیا ہے۔ سلام و قطعات کا گوشہ بہت خوب ہے۔ ایک خوبصورت شمارے کے لئے بہت بہت مبارکباد۔

ڈاکٹر ریشماں پروین

کھن کھن جی پی جی کالج، لکھنؤ

اکتوبر 2018 کا نیادور نظر سے گزرا سب سے پہلے میں آپ کو اس بات کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا نیادور کا پہلا شمارہ رثائی ادب نمبر ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ رثائی ادب پر جن لوگوں لکھا ہے وہ سب اردو کے اہم قلم کار ہیں۔ یہ بھی ایک بڑی بات ہے کہ آپ کو ان سب کا تعاون حاصل ہوسکا مضامین میں پروفیسر شارب ردولوی، علی احمد فاطمی اور لئیق رضوی کے مضامین میں رثائی ادب کا ایک نئے انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ مرثیہ کو نئے ناقدین نے 'مزاحمتی ادب' کا بھی حصہ قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے عادل فراز صاحب کا مضمون ایک نئی کوشش ہے۔ اس شمارے کا ایک بہت اہم مضمون 'لکھنؤ کے عزائی وتہذیبی آثار' ہے جسے روشن تقی صاحب نے لکھا ہے۔ یہ مضمون لکھنؤ کے آثار قدیمہ کی تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں روشن تقی صاحب اور تمام مصنفین کو مبارکباد دیتا ہوں۔ شعری حصہ بھی بہت اچھا ہے رباب رشیدی، کاظم جرولی، منور سلطانپوری، نیر سلطانپوری، بلونت سنگھ کے سلام متاثر کرتے ہیں۔ میں آپ کو اور آپ کے اس ادارے کو اس اہم نمبر کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

صغیر حسنین

راجہ جی پورم، لکھنؤ

نیادور اکتوبر کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ انتظار کی گھڑی ختم ہونے کے ساتھ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ ایسے موقع پر اپنی طرف سے بحیثیت قلم کار و ناصر لائبریری کے زیر انتظام چلنے والے ''مکتبہ ناصر'' اور ''انجمن محبان فروغ اردو گورکھپور'' کا ایک خادم دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

نیا دور کی ایک الگ پہچان ہے۔ بالخصوص خاص نمبروں کے حوالے سے جس کا سہرا ماضی قریب کے مدیر محترم ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کے سر جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سہیل وحید صاحب نے اپنے مختصر دور ادارت میں نیا دور کو اپنے نام کا ترجمان بنانے کی اچھی کوششیں کیں۔ آگے آپ کی ذات سے امید قوی ہے کہ ماضی کی ادبی خدمات کو مزید وقعت دینے کی بھرپور کوششیں جاری رکھیں گے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو بدخواہوں کی بدخواہی اور تنگ نظروں کی تنگ نظری سے محفوظ رکھتے ہوئے بلاتفریق مذہب وملت دوسروں کے حقوق نبھانے اور اپنے فریضۂ منصبی پر تادیر استقامت کے ساتھ قائم و دائم رکھے۔ کسی بھی کام کا حسن انجام جب ممکن ہے، متعلقین کے درمیان اخلاص کے ساتھ باہمی تعاون قائم رہے۔ جیسا کہ آپ نے اپنی بات میں ذکر کیا ہے کہ ''میں امید کرتا ہوں کہ اردو کے ادباء وناقدین اور شعراء کا تعاون مجھے اسی طرح حاصل رہے گا تاکہ نیادور اپنے سفر کے سنگ میل قائم کرتا ہوا آگے بڑھتا رہے۔''

اردو نہ صرف دنیا کے چند ممالک میں بلکہ بیشتر ممالک میں اپنی مقبولیت کا پرچم لہرا رہی ہے۔ جس کی مثال اس بات سے دی جاسکتی ہے کہ اردو کے رسائل میں ہر طرح کی نگارشات بیرون ملک کی بھی ہوا کرتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک و بیرون ملک میں ہر صنف ادب کے قلم کار موجود ہیں۔ لیکن نیادور کا تازہ شمارہ اکتوبر میں اس کی کمی کا احساس ہوا! امید ہے کہ آئندہ اس بات کا ضرور ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ اس طرح ہر اہل قلم کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ انھیں ان کا جائز حق بھی ملے گا۔

اسی کے ساتھ ایک گزارش یہ بھی ہے کہ ماہنامہ، ماہنامہ بن کر رہے سہ ماہی اور ششماہی نہ بن جائے۔ اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

روشن صدیقی

ناصر لائبریری، ابوبازار (گورکھپور)

ریاستی گورنر جناب رام نائک کی موجودگی میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اجودھیا میں منعقد 'دیپ اُتسو' پروگرام کا شمع روشن کر کے آغاز کرتے ہوئے (۶ر نومبر ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جنوبی کوریا کی پہلی خاتون محترمہ کم جونگ سوک کے ساتھ ایودھیا میں 'دیپ اُتسو' پروگرام کے موقع پر (۶ر نومبر ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور کے موضع ونٹا نگیاں کے بچوں کو دیوالی کا تحفہ دیتے ہوئے (۷ر نومبر ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک کی موجودگی میں وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ راج بھون میں ان کی اہلیہ کو دیوالی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے (۷/نومبر ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ایودھیا میں جنوبی کوریا کی خاتون اول محترمہ کم جونگ سوک کے ساتھ نیا گھاٹ پر سریو جی کی پوجا اور آرتی کرتے ہوئے (۶/نومبر ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 73 अंक 07
नवम्बर 2018
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, **f'kf'kj]** निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**